ویدراج لوٹیے

انمول رتن

وید راج لوٹیجہ

یہ کتاب ہریانہ اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کی جا رہی ہے۔

اَنمول رَتَن

وَیدراج لُوتھرہ
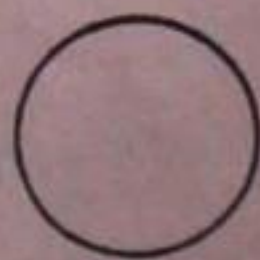
مَوڈرن پبلشنگ ھاؤس
۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج،
نئی دھلی ۲-۱۱۰۰۰

پہلی بار : ۱۹۹۰ء

قیمت : پینتیس روپے /35

طباعت : اے ون آفسیٹ پرنٹرز، دہلی ۶

کتابت : ایم حسن ان اعظمی

سرورق : رزاق ارشد

زیر اہتمام
پریم گوپال متل

ANMOL RATAN (SHORT STORIES)
BY VED RAJ TUTEJA. RS. 35/-

پیش لفظ

یہ بات ہریانہ اردو اکادمی کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے کہ ہریانہ کے ادیبوں اور شاعروں کے مسودات کی اشاعت کے لیے مالی امداد فراہم کی جائے جناب وید راج لوٹیجہ کا مسودہ بعنوان "انمول رتن" اسی مقصد کی تکمیل ہے۔

"انمول رتن" میں شامل کہانیاں اصلاحی اور سماجی مسائل پر مبنی ہیں جس میں معاشرے میں پھیلی ہوئی خرابیوں اور ان سے پیدا شدہ مشکلات کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ "انمول رتن" میں شامل کہانیاں آسان اور سلیس زبان میں تحریر کی گئی ہیں جو اردو کے ہر طبقہ کے پڑھنے والوں کے لیے بہتر ثابت ہوں اور ان کی اردو حلقہ میں پذیرائی ہو گی۔

کشمیری لال ذاکر
(سکریٹری)

اظہارِ عقیدت

کہانیوں کا یہ چھوٹا سا مجموعہ " انمول رتن " جو پیشِ خدمت ہے اسے تحریر کرنے کی تحریک مجھے اپنے مہربان بزرگ شری موہن لال جی چوپڑہ فرید آباد نواسی سے ملی۔ اس کی تکمیل میں مجھے اپنے بھائی صاحب شری دیسراج جی لوٹیجہ پروپرائٹر سائنٹفک گلاس ورکس انبالہ کینٹ سے کافی امداد و رہنمائی ملی۔ اُنہوں نے اسے حشو و زوائد سے پاک کیا۔ اسی طرح اردو کے چند اور نامور ادیبوں نے بھی اپنا قیمتی وقت صرف کر کے ان کہانیوں کی نظرِ ثانی فرمائی۔ میں اُن جملہ کرم فرماؤں کا جو ممد و معاون رہے اُن سب کا خلوصِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جو میرا خوشگوار فرض بنتا ہے۔

وید راج لوٹیجہ

(ایم۔ اے۔ ادیب عالم۔ ادیب فاضل)

دیباچہ

ناظرینِ باتمکین نے اُردو زبان میں بے شمار اچھی سے اچھی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ نو کہانیوں کا یہ ایک چھوٹا سا مجموعہ موسومہ "انمول رتن" اب میں اہلِ ذوق حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ ہیچمدان ناتواں سے کیا ہو سکتا تھا بقول شخصے من آنم کہ خود دانم۔ اس مجموعہ کی تکمیل صرف امدادِ ایزدی سے ہوئی ہے۔ اُمید کرتا ہوں کہ صاحبانِ فہم و فراست اسے پسند فرمائیں گے۔ میں خود تو کیا کہوں، مُشک آنست کہ خود ببوئید نہ کہ عطار بگوید۔

اُردو زبان و ادب کے ساتھ میری دلچسپی قدیمی ہے۔ مَیں نے ۱۹۳۸ء و ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم و ادیب فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ بی۔اے میں فارسی پڑھی، ساتھ ہی اُردو زبان کے نامور مصنّفین اور افسانہ نگاروں کی تصنیفات کا مُطالعہ بھی ہمیشہ میرا جُزوِ زندگی رہا ہے۔ ان جملہ وجُوہات سے ہی مجھے قلم اٹھانے کا حوصلہ ہوا۔ یہ کہانیاں مَیں نے اپنی زندگی میں پہلی بار لکھی ہیں اور وہ بھی ستر سال کی عمر میں۔

اس مجموعہ میں عام طور پر پند و موعظت اور اخلاقی قدروں کے پہلو ملیں گے۔ آخری کہانی البتہ مزاح کا رنگ لیے ہوئے ہے تاکہ اس تنگ و دو کے زمانے میں جب کہ انسان کو ہنسنا تو درکنار مسکرانے کا موقع بھی کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ دل کو کچھ تو فرحت و انبساط کا احساس ہو۔ ان کہانیوں میں چند الفاظ انگریزی اور چند الفاظ ہندی زبان کے ملیں گے۔ یہ الفاظ ایسے ہیں جو ہمارے روزمرّہ استعمال میں آتے ہیں۔ کہانیاں ایسے پیرایہ میں لکھی گئی ہیں کہ اوسط درجے کا اُردو خواں بھی آسانی سے سمجھ سکے۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی اشد ضروری ہے کہ ان کہانیوں کے سب کردار خیالی ہیں۔ اسی طرح مقامات اور واقعات بھی فرضی ہیں۔ اگر کہیں کوئی تھوڑی یا زیادہ مطابقت نوٹس میں آجائے تو اُسے محض اتفاقیہ سمجھا جائے۔ مصنّف، پرنٹر یا پبلشر پر ہرگز کوئی ذمّہ داری عائد نہ ہوگی۔

پیشِ نظر مجموعہ میں اربابِ ذوق و اہلِ نظر کو کچھ ادبی سقم نظر آئیں گے۔ شائقین نکتہ چیں و حضراتِ خوردہ بیں سے میری یہی استدعا ہے کہ وہ صرف شعر درجِ ذیل کو نظر کے سامنے رکھیں، اپنے قیمتی مشورہ سے مستفید فرماویں اور حوصلہ افزائی فرمائیں۔ بہ بخش گر بخطائے رسی و طعنہ مزن، کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود۔ اگر یہ مجموعہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا تو عنقریب دوسرا مجموعہ بھی پیشِ خدمت کیا جائے گا۔

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

خاکسار:

ویدراج لوٹیجہ

(ایم اے۔ ادیبِ عالم۔ ادیبِ فاضل)

کوٹھی ۳۰۴۴ سیکٹر ۷ بی، فرید آباد۔ ۱۲۱۰۰۶ (ہریانہ)

ٹیلیفون رہائش: ۴۱۶۳۴ ؛ فیکٹری: ۲۷۶۹۶

فہرست

جیتے جی سورگ دیکھو

ضلع حصار (ہریانہ) کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں کبھی ایک برہمن پریوار رہا کرتا تھا۔ پنڈت سالگ رام اور ان کی بیوی شریمتی جنک رانی، ان کا ایک لڑکا تھا ہری چند اور اس کی عمر تقریباً ۱۹ سال کی تھی اور ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام شانتی تھا اور وہ پندرھویں سال میں قدم رکھ چکی تھی۔ پنڈت جی جیوتش کا کام اچھی طرح سے جانتے تھے۔ اردگرد کے دیہات کے لوگ اپنے بچوں کی شادیاں اور نئے مکانوں وغیرہ کا مہورت نکلوانے کے لیے ان ہی کے پاس آتے۔ وہ طمع سے دُور رہتے تھے جو کچھ بھی کسی نے نقدی یا پھل یا کپڑا وغیرہ دے دیا اُسے خوشی سے قبول کر لیتے۔ قناعت کا گُر خُوب پڑھ رکھا تھا اس لیے انھیں کبھی بھی اپنی برادری میں میل ملاپ رکھنے میں، خانگی اخراجات کو پُورا کرنے میں یا بچوں کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے میں کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا پنڈت جی کی بیوی اپنے خاوند کی سیوا اور اپنے بچوں کی نگہداشت کی ذمہ داری بوجہ احسن بھگتاتی اور اس میں وہ فخر محسوس کرتی تھی۔ بچے بڑے ہونہار تابع دار اور پڑھائی میں ہوشیار تھے۔ اس طرح ان کا جیون بڑے مزے سے گزر رہا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ بچوں کی عمر بڑھتی جا رہی تھی، اور اب وہ اسکول کی پڑھائی

سے فارغ ہو چکے تھے۔ ہری چند وقت گزارنے کے لیے ممبئی کلاس میں داخل ہو گیا اور شانتی کو ماں نے امورِ خانہ داری کی ٹریننگ دینی شروع کی۔ ساتھ ساتھ اسے سلائی کڑھائی اور بنائی کا کام سکھانا شروع کر دیا کہ لڑکی پرایا دھن ہوتی ہے اپنے سسرال جا کر اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ بہو اگر کھانے پکانے کے کام میں اچھی طرح ٹرینڈ نہ ہو تو سسرال والے اکثر لڑکی کی ماں کو ہی بُرا بھلا کہتے ہیں۔ وہ اس گلہ سے بچنا چاہتی تھی۔

ایک دفعہ شریمتی جنک رانی نے موقعہ پا کر اپنے خاوند سے ان بچوں کی شادی کی بات چلائی۔ کہنے لگی "میرے پران ناتھ عزیزم ہری چند اب بیس سال کا ہو گیا ہے۔ ابھی تک تو وہ کسی بُری صحبت میں پھنسا نہیں۔ اس کے خیالات نیک ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی ہم اب شادی کر دیں کیونکہ نوجوان لڑکوں کے اس عمر میں خیالات کے بدلنے کا پورا پورا احتمال ہوتا ہے۔ خیالات بعض دفعہ اس قدر بدل جاتے ہیں کہ وہ اسے قعرِ ذلت میں دھکیل دیتے ہیں۔ آپ تو پورے وِدوان ہیں۔ خوب اونچ نیچ دیکھ رکھی ہے آپ کو کچھ سمجھانا تو ایسے ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان کے خیالات ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ وہی تمھیں دیوتا بنا دیتے ہیں تو وہی تمھیں چور، اُچکا ڈاکو بھی بنا سکتے ہیں۔ بیٹے نے تو اپنی زبان سے شادی کے لیے کہنا نہیں۔ یہ ماں باپ کا ہی فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو نبھائیں۔ میں زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتی چونکہ لڑکا اپنی بہن سے دو تین سال بڑا ہے اس لیے پہلے اس کی شادی کے لیے موزوں گھر اور موزوں لڑکی دیکھیے"۔ ساتھ ہی ہنسی مذاق میں پنڈت جی کو سنا دیا "آپ نے خود تو سولہ سال کی عمر میں شادی کرا لی تھی اب آپ کیوں اس معاملہ میں دیر لگا رہے ہیں؟" پنڈت جی آخری بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑے اور اُسے کہنے لگے "بھاگوان! آج تو تم نے خوب باتیں کہی ہیں۔ آپ کو یہ غلط فہمی ہے کہ میں اپنی ذمہ داری سے غافل ہوں۔ میں ہرگز غافل نہیں ہوں۔ پہلے ہی میں نے برادری میں اور اپنے واقف کاروں کو کہہ سن

رکھا ہے لیکن میری کوشش اور توجہ کا مرکز کماری شانتی بنی ہوئی ہے نہ کہ عزیز ہری چند۔
شانتی کی شادی میری نظر میں پہلے ضروری ہے لڑکے کی شادی اگر بعد میں بھی ہو جائے
تو چنداں ہرج نہ ہوگا۔" جنک رانی نے پنڈت جی کو بات چیت کے دوران ٹوکتے ہوئے
کہا "پنڈت جی! آپ ذرا اپنی اوقات کی طرف بھی دیکھیے۔ اگر ہمارے پاس فارغ البالی
ہوتی تو کیا ہم ان بچوں کو اعلیٰ پڑھائی کے لیے دہلی نہ بھیج دیتے۔ میں آپ کی سچی غم گسار ہوں۔
دکھ سکھ ہمارا مشترکہ ہے ہم دونوں نے مل کر گرہست کی گاڑی چلانی ہے۔ بطور رفیقہ حیات
میں آپ کو ایک صلاح دینا چاہتی ہوں اور یہ صلاح بھی آپ کی بہبودی اور آپکے آرام
کو مدِنظر رکھ کر ہی دے رہی ہوں۔ ماننا نہ ماننا آپکے اختیار میں ہے۔ آپ شادی پہلے
ہری چند کی سرانجام دیں۔ اس کے جہیز میں جو سامان آئے گا اس میں سے کچھ ہم بیٹی کے
جہیز میں دے سکیں گے۔ آپکا بوجھ قدرے ہلکا ہو جائے گا۔" پنڈت جی یہ بات سن کر قدرے
تلملا اٹھے۔ کہنے لگے۔ "پریہ! تیری یہ بات مجھے ایک آنکھ نہیں بھائی۔ لڑکے کے جہیز سے میں تو
ایک چیز بھی اٹھانا نہیں چاہتا کیوں کہ اس طرح سے ہماری آنے والی بہو کے دل کو ٹھیس
پہنچے گی اور جب اسے موقع ملے گا وہ ہم سے علیحدہ ہو جائے گی اور اس طرح اپنی ناراضگی
کا اظہار کرے گی۔ ہمارا ایک ہی تو لڑکا ہے۔ اکٹھے ہی رہنے کا پروگرام رکھنا چاہیے،
نہیں تو گلی محلہ میں بڑی بدنامی ہوگی۔ البتہ آپ کی یہ صلاح کہ لڑکی کی شادی سے پہلے لڑکے
کی شادی ہو جائے غور طلب ہے۔ میں اس پر خوب سوچ وچار کروں گا اور اپنا فیصلہ دو چار
دن میں بتلا سکوں گا۔"

پنڈت جی نے جنک رانی پر دو چار دن سوچنے کے بعد اپنے خیالات کا یوں اظہار
کیا۔ "جنک رانی! اپنے گھر میں پہلے شبھ کارج کا آغاز ہری چند کی منگنی سے ہوگا۔ اس کی منگنی اور
شادی میں سات آٹھ ماہ کا وقفہ رکھ لیا جائے گا۔ اس دوران شانتی کی منگنی کر کے بیاہ بھی
کر دیا جائے گا۔ اب آپ اپنی رائے دو تاکہ میں اس پروگرام کے مطابق اپنے دائرہ احباب

میں ابھی سے سلسلہ جنبانی شروع کر دوں۔ اچھے گھر دیکھنے ہیں اس لیے وقت تو لگے گا ہی۔"
شریمتی جنک رانی کے لیے یہ فیصلہ ایک مژدۂ جانفزا سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس نے فوراً ہاں کر دی۔
ایک تو اس کی ذاتی خواہش کے مطابق لڑکے کا کام پہلے شروع ہو رہا تھا دوسرا اُس کو یہ بھی
احساس ہو گیا کہ پنڈت جی اپنے بچوں کی ذمہ داری جلد بھگتنا چاہتے ہیں۔" نیکی اور پوچھ
پوچھ"۔ بات سن کر ہنس پڑی۔

پنڈت جی نے دَوڑ دُھوپ کر کے ایک اچھے گھرانے کی سوشیل لڑکی سروج سے
ہری چند کی سگائی کر دی اور ساتھ ہی شادی کے لیے سات آٹھ ماہ آگے کی تاریخ مقرر
کر لی۔ اسی طرح شانتی کی سگائی پنڈت گردھاری لال کے فرزندِ ارجمند چمن لال
سے کر دی اور شادی کی تاریخ دو ماہ کی رکھ دی۔ پنڈت سالگ رام نے پنڈت گردھاری
لال کو پہلے ہی واضح کر دیا کہ"میں ایک معمولی حیثیت کا مالک ہوں۔ شادی پر زیادہ
اخراجات برداشت نہیں کر سکوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ بعد میں کوئی شبہ گی پیدا ہو۔"
گردھاری لال بولا"پنڈت جی! نجابت بھی تو کوئی معنی رکھتی ہے۔ ہمیں تو لڑکی پسند
آ گئی۔ ہم نے ہاں کر دی۔ آپ صرف ایک ساڑھی دے کر شادی کر دیں ہمیں تو وہ بھی منظور
ہے۔ البتہ بارات کی خاطر تواضع آپ اچھی طرح کر دینا۔" سالگ رام نے یہ بات پلّے باندھ
لی۔ آخر شانتی کی شادی کا دن آ پہنچا۔ سالگ رام نے اپنا سارا سرمایہ اور اس کے
علاوہ کچھ دوستوں یاروں سے قرضہ لے کر بھی بارات کی خاطر تواضع میں لگا دیا کہ کہیں
برادری میں ناک نہ کٹ جائے۔ شادی کا پروگرام بطریقِ احسن بھگت گیا۔ چنانچہ
حسبِ دستور سالگ رام اور اُس کے کنبے نے لڑکی کو سکھ شادے کر اپنے نئے گھر روانہ
کر دیا۔

اب ذرا تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیے۔ تاریخِ مقررہ پر ہری چند کی شادی
کماری سروج سے ہو گئی۔ سروج بھی پڑھی لکھی اور بڑی سمجھدار لڑکی تھی۔ اُسے والدین نے

نے گھر جانے سے پہلے یہ تعلیم دی کہ "بیٹی سسرال میں جا کر سب چھوٹے بڑوں سے پیار اور سب کی درجہ بدرجہ عزت کرنا۔ پتی کی سیوا کرنا۔ اگر اس گھر کی کوئی بات تمہیں پسند نہ آئے تو بھی اسے بُرا نہ کہنا۔ پنجابی زبان کے حرف بھبھا کو ہر وقت یاد رکھنا۔ کوئی غلطی اگر تم سے سرزد ہو جائے تو بھُلّ (غلطی ہو گئی) کہہ دینا۔ کوئی نقصان ہو جائے تو بھانا (پرماتما کی مرضی ایسی تھی) کہہ دینا عام طور پر بھلا (جی ہاں) کہہ دینے سے ہی گھر والے خوش رہیں گے۔ وہاں ایسا کوئی کام نہ کرنا جس سے ہمارا سر نیچا ہو۔" سروج نے سسرال پہنچ کر ان سب باتوں پر عمل پیرائی شروع کر دی۔ ہری چند بھی بڑا محنتی تھا گاؤں میں ہی ایک ساہوکار کے پاس بطور منیم تھوڑے ہی مشاہرہ پر کام کرتا تھا اگرچہ وہ ماں باپ کا برخوردار بیٹا تھا مگر سروج سے بھی اُسے بڑا پیار تھا۔ ماں باپ کے ہر حکم کو وہ پرماتما کا حکم سمجھ کر اس کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا مگر بیوی کی بات کو بھی نہ ٹالتا تھا۔ گھر کی بہتری کے لیے ہری چند اور سروج نے مِل کر خوب کام کیا صفائی کر کے اسے شیشے کی طرح چمکا دیا اور برادری میں بھی خوب عزت پائی بلکہ سروج کا اردگرد رہنے والوں کی عورتوں سے اپنے ساس کی نسبت بھی زیادہ میل ملاپ ہو گیا۔ ایک تو زبان میٹھی، دوسرا بھبھا کا پاٹھ پڑھتے اور اُس پر عمل کرنے سے اس نے گلی محلّے میں اپنا مقام بنا لیا۔ یہ بات جنک رانی کو پسند نہ تھی اور وہ اکثر سروج کو اس طرح گلی محلّے میں ملنے جلنے سے روکتی رہتی تھی جب سروج نے اپنی ساس کی بار بار تنبیہ کی پروا نہ کی تو اس کی ساس اندر ہی اندر کڑھنے لگی۔ اپنے خاوند اور بیٹے کو گاہے بگاہے اس کی شکایتیں کرنے پر تُل پڑی اور کسی مناسب موقع کی تاڑ میں رہنے لگی۔ کبھی کبھی وہ سروج کے میکے والوں کو بھی کوسنا شروع کر دیتی۔ سروج کا جواب صرف "بھلا" ہوتا۔ سروج سے ایک دن شیشے کا گلاس گر پڑا۔ جب ساس نے ڈانٹ ڈپٹ کی تو اُس نے جواب میں صرف "بھانا" کہہ دینا ہی کافی سمجھا گویا کہ وہ بہت کم بولتی تھی، ساس کے لیے یہ باتیں

ناقابلِ برداشت ہو رہی تھیں۔ قدرت کا کرنا کیا ہوا۔ ایک دن دروازے پر ایک
سادھو نے خیرات کے لیے صدا کی۔ اتّفاق سے جنک رانی نہا رہی تھی۔ سرونج نے گیہوں کے دانے
اپنے دونوں ہاتھوں میں بھرے اور جا کر سادھو کو دے دیے۔ راستے میں کافی گیہوں کے
دانے فرش پر بھی بکھر گئے۔ جنک رانی نے جب دانے اس طرح بکھرے پڑے دیکھے تو آگ
بگولا ہو گئی وہ تو پہلے ہی سے ایسے کسی موقعہ کی انتظار میں تھی۔ بہو پر برس پڑی "تم نے
اتنے دانے سادھو کو دینے کی جرأت کیسے کی؟ کیا تمھارے آنے سے مَیں گھر میں صفر ہو گئی ہوں۔
میں گھر میں موجود تھی۔ مر تو نہیں گئی تھی تم نے مجھ سے پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ یہ
سادھو تو ہٹّا کٹّا تھا۔ اس طرح تمھارا باہر گلی میں جا کر خیرات دینا مجھے ہرگز پسند نہیں ہے۔
جب مَیں گھر نہیں ہوتی نہ جانے تم کس کس کو جا کر خیرات بانٹتی رہتی ہو تمھیں کیا پتہ کہ کتنی
مشکل اور محنت سے پنڈت جی نے یہ دانے جمع کیے تھے۔ تم تو خیرات اس طرح سے کرتی ہو۔
گویا تمھارے میکے والوں نے ہی یہ دانے بھیجے ہوں جو کچھ انھوں نے تمھارے جہیز میں دیا تھا،
وہ بھی سب لوگوں نے دیکھا تھا۔ ہم تو ہر ایک کی طعن و تشنیع ہی سُنتے رہے۔ یہ تمھارا سسر
اور خاوند ہی ایسے بھلے لوگ ہیں کہ سب کچھ سُن کر بھی تمھارے والدین کو آج تک شکایت
نہیں کی، مگر اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے
گی۔ آخر تمھیں تمھارے میکے بھیجنا ہی پڑے گا جب جا کر تمھارا دماغ ٹھیک ہو گا۔ اس گھر
میں اب یا تو تم رہو گی یا مَیں۔ میرا یہ اعلان کان کھول کر سُن لو۔ آج پنڈت جی گھر آئیں
گے تو میں سارا قصّہ اُن کے گوش گزار کر دوں گی۔ مَیں گھر کی مالکہ ہو کر اب یہاں
خادمہ کے طور پر نہیں رہ سکتی۔" جنک رانی کا پارہ بہت تیز ہو رہا تھا۔ بیچاری سرونج
ایک بھیگی بلّی کی طرح ایک کونے میں دُبک کر کھڑی تھی صرف اتنا کہہ دینے پر ہی اس نے
اکتفا کیا "بھلا جی" ساس نے یہ سننا بھی پسند نہ کیا وہ تو اس سے ہاتھ پیر جوڑ کر معافی
مانگنے کی امید کر رہی تھی۔ ان الفاظ کو اس نے سرونج کی طرف سے اعترافِ گناہ سمجھا مگر

پھر بھی وہ سروج کو آسانی سے بخشنے والی نہ تھی۔ شام کو پنڈت جی گھر آئے تو جنک رانی غصہ سے آگ بگولہ ہو رہی تھی۔ ماتھے کے تیور چڑھے ہوئے تھے۔ پنڈت جی بڑے جہاں دیدہ اور قیافہ شناس تھے۔ فوراً سمجھ گئے کہ آج کوئی خاص بات ہے کوئی نہ کوئی بلا نازل ہونے والی ہے۔ انھوں نے جنک رانی سے جب تفحصِ حال کیا تو اس نے سادھو کو سروج کا خیرات دینے کا معاملہ اپنے ہی ڈھنگ سے مرچ مصالحہ لگا کر اس طریقے سے پیش کیا کہ پنڈت جی بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہو گئے اور کہنے لگے۔ "آج ذرا ہری چند کو آجانے دو میں اسے کہہ دوں گا کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ یَیں بھی رانی تو بھی رانی۔ کون بھرے گا پانی۔ سروج یہاں ہماری زندگی میں ہی گھر کی مالکہ بن بیٹھی ہے۔ ہم اُس کی غلامی ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ اس لیے وہ کل ہی جاکر سروج کو اس کے میکے پہنچا آئے۔ ہم ذلّت کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔" چنانچہ ہری چند کی آمد پر پنڈت جی نے وہ سارا ڈرامہ کھیلا جس کی تعلیم وہ اپنی بیوی سے حاصل کر چکے تھے اور برخوردار بیٹے نے اپنی بیوی کو اگلی صبح اپنے سسرال واپس پہنچانے کا اعلان کر دیا۔ چند گھنٹوں میں ہی اس طرح سروج کی قسمت کا فیصلہ ہونے لگا۔ مگر کسی کو کیا پتا کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آنے والا ہے۔ البتّہ ہری چند نے تھوڑی سی سمجھداری سے کام لیتے ہوئے ماں باپ سے صرف اتنا سوال کیا کہ "سروج پر جب الزام لگایا گیا تھا تو اس نے کوئی جواب بھی پیش کیا یا نہیں؟" جنک رانی کہنے لگی۔ "بیٹا! جواب میں اس نے 'بھلا جی' کہا تھا۔ اس کے علاوہ معافی مانگنے کے لیے اس کی زبان نہ پھوٹی۔" یہ جواب پا کر ہری چند کو اپنی بیوی کا تیاگ قدرے مشکل نظر آنے لگا۔ اتنی چھوٹی سی غلطی پر اس قدر کڑی سزا کو وہ کس طرح حق بجانب قرار دے سکتا تھا۔ اُسے اپنی بیوی کی صفات کی وجہ سے پیار بھی بہت تھا مگر ساتھ ہی والدین کے ہر جائز ناجائز حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ بڑا آگیا کاری پتر تھا۔ جب اس نے سروج کو اپنے والدین کا حکم سُنایا تو اسے

بالکل کوئی حیرانگی نہ ہوئی اور اس نے "بھلا جی" کہنے کے علاوہ کچھ نہ کہا اور سفر کے لیے اپنے سامان کو باندھنے میں لگ گئی اب ہری چند بھی اسی سوچ میں پڑ گیا کہ واقعی سروج نے کوئی بڑی غلطی کی ہے۔

دوسرے دن علی الصباح ہری چند اور اس کی بیوی سر پر سامان رکھے گھر سے نکلے۔ اپنے ماں باپ کو جھک کر پرنام کیا اور در و دیوار پر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ یہ دونوں مسافر راستے میں جب تھک کر چور ہو گئے تو ایک گھنا پیپل کا درخت دیکھ کر اس کے نیچے ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سروج نے مہرِ سکوت توڑی۔ دونوں کے دلوں پر غم نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ کہنے لگی "پرم پران ناتھ! اگر اجازت ہو تو میں آپ سے ایک سوال پوچھوں؟" ہری چند سمجھ گیا تھا کہ سروج کا سوال کیا ہو گا۔ اپنے آپ جواب دینے لگا۔ "پریہ سروج! میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم بے قصور ہو مگر میں اپنی جگہ پر مجبور ہوں۔ کیا مہاراجہ رام چندر نے اپنے باپ کے حکم کی تعمیل میں راج پاٹ تیاگ کر کے چودہ برس کا بن باس قبول نہیں کیا تھا؟ ان کے حکم کو ماننا تو میں اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہوں۔ خواہ اس کے لیے مجھے کتنی تکالیف کا بھی سامنا کرنا پڑے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم کچھ بھی کر لیں ہم ان کا احسان اتار نہیں سکتے" یہ سن کر سروج کو کہنا پڑا "پتی دیو! آپ نے میرا سوال تو ابھی سنا ہی نہ تھا کہ اپنی صفائی پیش کرنی شروع کر دی۔ میں نے تمہیں آج تک کبھی اپنے والدین کے حکم نہ ماننے کے لیے کہا ہے؟ میں تو خود اس بات کو تسلیم کرتی ہوں کہ ہم کبھی بھی ان کے احسانات نہیں اتار سکتے اور نہ بچوں کا سب سے پہلا فرض ماں باپ کے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ میں تو اپنے اور سوالات کا سیدھا جواب چاہتی ہوں" ہری چند نے اثبات میں سر ہلایا تو ان کے درمیان حسبِ ذیل دلچسپ اور فیصلہ کن بات چیت ہوئی۔

سروج: "پران ناتھ! کیا آپ کے خاندان میں دان دینے یا دان لینے کو برا سمجھا جاتا ہے اور آپ کے خاندان کے تمام افراد نے دان دینے اور دان لینے سے کبھی پرہیز کیا ہے؟"

ہری چند:" سروج! ہم برہمن ہیں اور ہمارے خاندان نے قسم کھا رکھی ہے کہ کبھی کسی سے دان نہیں لیں گے۔ جب کہ دان دینے میں ہمیں مطلقاً کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بشرطیکہ دان مانگنے والا صحیح معنوں میں ضرورت مند اور مستحق ہو۔"

سروج:" کرپا کر کے اب یہ بتائیے کہ آپکے گھر کے کتنے ممبر ایسے ہیں جو اس رسم کے پابند ہیں اور دان نہ لینے کا اتنا سخت فیصلہ کیوں کر رکھا ہے؟"

ہری چند:" پریہ سروج! ہمارے گھر کے سارے ممبر اس رسم ورواج کے پابند ہیں۔ نامعلوم کب سے یہ رسم چلی آتی ہے۔ اس میں کوئی چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ ہم لوگ دان لینے کو ایک قسم کا قرض مانتے ہیں۔ قرض جو لیا جائے اُسے بمعہ سود بھگتانا پڑتا ہے۔ اگر وہ قرض ایک جنم میں بےباق نہ ہوسکے تو اس کی ادائیگی کے لیے اور جنم لینے پڑتے ہیں۔ جو صرف انسانی جامہ میں ضروری نہیں ہوتے بلکہ بیل بن کر، گھوڑا بن کر بھی بھگتان کرنے پڑتے ہیں اس لیے دان نہ لینا ہی بہتر ہے۔"

سروج:" یہ بتانے کی بھی کرپا کیجیے کہ اگر آپکے خاندان کا ایک فرد دان لے لیتا ہے تو کیا اُس کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے یا نہیں؟"

ہری چند:" جی ہاں۔ اس کا بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے تاکہ ہم سب دان نہ لینے کے پابند رہیں۔"

سروج:" کیا میں یہ مان لوں کہ آپ صرف سچ ہی کہہ رہے ہیں اور آپ کی بات میں کوئی بناوٹ نہیں؟"

ہری چند:" میں اپنی طرف سے سچ ہی کہہ رہا ہوں۔ اس میں ذرہ بھر بھی جھوٹ کی آمیزش نہیں ہے۔ آپ شک کیوں کر رہی ہیں؟"

باتوں باتوں میں کافی وقت گزر گیا اس لیے دونوں خاوند و بیوی پھر عازم سفر ہوئے۔ چلتے چلتے جب سروج کے گاؤں کی سرحد آگئی تو ہری چند کہنے لگا:" پریہ سروج!

اب سامنے ہی تمھارا گھر نظر آ رہا ہے۔ تم چلی جاؤ تاکہ میں بھی واپس اپنے گھر جا سکوں۔ خاوند کے لیے بیوی کی جدائی خواہ عارضی ہی ہو کچھ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں بہہ رہی تھیں۔ سروج نے صرف "بھلا جی" کہا اور اپنے میکے کے گھر کی راہ لی اور ہری چند نے وہاں سے واپسی کا رخ کیا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہے تھے۔ اچانک سروج کے دل میں ایک خیال آیا اور اُس نے بجائے آگے جانے کے پھر ہری چند کا پیچھا شروع کر دیا۔ ہری چند نے پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو سروج سایہ کی طرح پیچھے لگی ہوئی ہے، ٹھہر گیا اور کہنے لگا "سروج! تو اب کیوں میرے پیچھے آ رہی ہے؟ جو زندہ رہے ملیں گے پھر خالق نے گر ملا دیا۔"

سروج "مجھے یہ تو بتاتے جاؤ کہ کیا دیا ہوا دان کبھی واپس لیا جاتا ہے؟"

ہری چند "پر یہ سروج! بس۔ دان دینے والا اپنا دیا ہوا دان کبھی واپس نہیں لیتا۔"

سروج "آپ ذرا سوچیے میرے ماں باپ نے بھی تو میرا دان کیا تھا۔ اور اس لحاظ سے میرا اب میکے گھر سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں کس منھ سے بن بلائے میکے گھر جاؤں۔ کیا آپ دان لینے سے انکار کر سکتے ہیں؟ کہاں گئے آپ کے بزرگوں کے بنائے ہوئے رسم و رواج؟ آپ کے والدین بالکل جھوٹے ہیں۔ انھوں نے دان لیا ہے، اور آپ ان جھوٹے آدمیوں کے حکم کی تعمیل میں فخر محسوس کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے والد صاحب نے جب آپ کی والدہ کا دان منظور کیا تھا تو کیا انھوں نے تمھاری ماتا جی کو گھر سے نکالا تھا، اور یہی سلوک کیا تھا جو آج آپ میرے ساتھ کر رہے ہیں؟ آپ ماں باپ کے حکم کو خدائی حکم مان رہے ہیں جس سے سرتابی کا تمھیں بالکل حوصلہ نہیں۔ آپ بالغ ہیں، مرد ہیں، عورت کا حوصلہ اور اس کی عزت اپنے خاوند کی وجہ سے ہوتی ہے۔ تم میں اپنے نفع نقصان سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میرے کرم پھوٹے جو تم سے شادی ہو گئی۔"

ہری چند جب سروج کی یہ باتیں سن چکا تو اس کے پاؤں تلے زمین کھسکنے لگی۔

من ہی من میں سوچنے لگا کہ میں تو سروج کو اب تک ایک بھولی بھالی لڑکی سمجھتا رہا۔ مگر یہ تو
بہت گن وان ہے۔ ہمارے دھرم کے متعلق اس کی جانکاری میرے سے کہیں بڑھ کر ہے۔
اسے "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" والی مثال کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ نہ بیوی کو
چھوڑ سکتا تھا نہ ماں باپ کے حکم کو موڑ سکتا تھا۔ عجب کش مکش میں بے چارہ پھنس گیا۔ اسے
اچھی طرح یہ لوک پر زبان تھا کہ "ہوتا آیا ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں"۔ بعض دفعہ کسی بات
کا مطلب غلط بھی لیا جاتا ہے۔ سروج کے ساتھ بھی یہی ہوا ہوگا۔ وہ ہر بات کا جواب "جی
مہاراج جی" کہہ کر دیتی رہی۔ گونگی تو نہیں تھی۔ اگر ہر بات کا پورا پورا تسلی بخش جواب دیتی
رہتی تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ اور مجھے بھی آج اس قدر ذلت نہ اٹھانی پڑتی۔ اب جو مقدر
میں لکھا ہے مل جائے گا۔ سروج نے ہری چند کو اس قدر غمگین دیکھا تو اس سے رہا نہ
گیا۔ بول اٹھی: "پتی دیو! آپ شوق سے جائیے اور اپنے محترم والدین کے حکم کے مطابق
عمل کیجیے باقی دنیا جائے بھاڑ میں۔ میری چنتا آپ ہرگز نہ کیجیے۔ میرے والدین سے
یہ توقع کرنا کہ وہ مجھے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دیں گے بالکل فضول ہے اور
آپ اپنے گھر میں جگہ دینے کو تیار نہیں ہیں گویا آپ کے ساتھ میرا رشتہ منقطع ہو چکا ہے تو
اب آپ اپنی راہ لیجیے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے جس پرماتما نے مجھے پیدا کیا ہے وہ
سب کا والی ہے۔ اسے تو ہر ایک کی فکر ہے۔ وہ بے آسرا لوگوں کا آخری آسرا ہے۔ مجھے اس پر
پورا پورا وشواس ہے۔ میں اسی طرح باقی زندگی بھی گزار لوں گی۔ جس کے سر پر پرماتما
کا ہاتھ ہوتا ہے اس کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ مجھے پتی ورت دھرم مجبور کر رہا ہے
ورنہ میں اس جگہ کھڑی کھڑی آپ جیسے خاوند کو فوراً تیاگ دیتی۔ ایک بات اور بھی
ابھی واضح کر دوں کہ میں کسی قیمت پر اب آپ کے گھر نہ جاؤں گی۔ ایک دفعہ آپ کے گھر والوں
نے مجھے گھر سے بے عزت کر کے نکال دیا ہے آپ شوق سے جائیے۔ اپنے دل سے میرا خیال
ہمیشہ کے لیے نکال دیجیے اور آرام و سکون کی زندگی اپنے والدین کے سایۂ عاطفت میں

کاٹیے، مگر اتنا ضرور بتا دیجیے کہ کیا آپ مجھے اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہیں یا نہیں ؟ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ کیا ہوا میرے سسر نے میری ساس کے بہکاوے پر اتنا سخت قدم اٹھایا جس کی ان کی ذات سے توقع نہ تھی "

ہری چند کا دل سروج کی باتوں سے بہت پسیج گیا۔ سوچ میں پڑ گیا کہ ایک دن تو پرماتما کو منھ دکھانا ہے۔ گڑگڑا کر سروج کو کہنے لگا۔ " سروج! میں تو اندھیرے میں گمراہ ہو رہا تھا۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب میں تیرا ہاتھ چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ میں ہر وقت اور ہر کام میں تیرا شریک ہوں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ساس اور بہو میں تنازعہ کے کارن غلط اندیشی، غلط فہمی اور غلط روی ہوتے ہیں "

سروج نے دیکھا کہ ہری چند تو صاف دل انسان ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا اپنی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے کیا ہے۔ اس لیے قابل معافی ہے۔ کہنے لگی " میری تجویز سنیے۔ ہم دونوں اکٹھے واپس آپ کے گھر چلتے ہیں۔ مگر میں گھر سے دور ہی ٹھہری رہوں گی۔ آپ اپنے والدین سے جائیداد کا حصہ مانگ لینا اور لے لینا۔ یہ بھی بتا دینا کہ میں اپنی بیاہتا استری کو کسی قیمت پر تیاگ کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ ہاں تو اگر وہ تمھیں کوئی حصہ نہ دینا چاہیں تو مضائقہ نہیں تکرار مت کرنا " اس فیصلہ کے مطابق وہ دونوں گھر واپس پہنچے جہاں سے صبح کو گئے تھے۔ سروج گھر سے فاصلہ پر ہی رکی رہی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق ہری چند نے عمل کیا۔ گھر والوں نے سروج کو معافی دینے کا وعدہ دیا اور اسے گھر لے آنے کے لیے زور دیا مگر ہری چند اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ آخر مجبور ہو کر جب انھوں نے دیکھا کہ ہری چند پر اپنی عورت کا جادو اس قدر چل چکا ہے کہ اب یہ ہماری کوئی بات بھی سننے کو تیار نہیں اور ان تلوں میں تیل نہیں تو انھوں نے مبلغ پانچ صد روپیہ چہرہ شاہی اس کے حوالے کیے۔ ہری چند نے بصد شکریہ وہ رقم لے لی اور سروج کے پاس پہنچ کر کہنے لگا " یہ رقم حاضر ہے اب اگلا پروگرام بتائیے "

سروج "میرے سرتاج! یہ رقم آپ کے ماتا پتا کی طرف سے آئی ہے۔ اس لیے اس پر آپ کا حق فائق ہے۔ اگر آپ سرمایہ سے کوئی کاروبار کر سکتے ہیں تو خوشی سے کرو۔ ہم دونوں مل کر کام کریں گے۔ اور ہماری دونوں کی قسمت بھی اب مل کر کام کرے گی۔ میرا پختہ یقین ہے کہ ہمارے دن پھر جائیں گے۔ محنت اور تندہی اور نیک نیتی ضرور اپنا نتیجہ دکھلائے گی۔ اور اگر آپ کچھ نہیں کر سکتے تو سچ سچ بتا دو۔"

ہری چند "مجھے تو صحیح معنوں میں کسی بھی کام کا تجربہ نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم یہ رقم برباد کر بیٹھیں تم ہی اپنی تجویز بتلاؤ۔"

سروج "اچھا پھر ایسا کرو کہ یہ تمام رقم مستحق حاجت مندوں کو بانٹ دیجیے اس کام سے فارغ ہو کر ہم اپنے اگلے سفر پہ روانہ ہو جائیں گے۔ ہاں ایک میری ضروری بات آپ بھی اپنے دل کی تختی پر نوٹ کر لیں۔ تکلیف میں کبھی نہ گھبراتا۔ دُکھ سُکھ کو برابر سمجھنا، جھُوٹ سے بچنا، دان دل کھول کر دینا اور دان اس طرح سے دینا کہ ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے ہاتھ کو پتہ نہ لگے۔ زیادہ سے زیادہ وقت پرماتما کا نام لینے میں اور پبلک کے کام سنوارنے میں لگانا۔ یتیموں، بیواؤں اور غریبوں کی پوری پوری امداد کرنا کسی بزرگ نے کیا خوب کہا ہے کہ 'تمھارے پاس جو کچھ اچھے سے اچھا ہے۔ وہ تم دُنیا کو دے دو۔ دُنیا اپنی اچھی سے اچھی چیز میں تمھیں لوٹا دے گی۔' ان کی مدد سے آپ کو جیتے جی سورگ کے درشن ہوں گے۔ جیسا کہ پہلے آج تک کبھی نہیں ہوا۔" چنانچہ انھوں نے وہ ساری رقم دان کر دی۔

وہ سُوبھاگ جوڑی اب پھر سفر پہ روانہ ہو گئی۔ پیسہ پاس نہیں۔ سب کچھ دان کر چکے تھے۔ کمزوری اور نقاہت نے غلبہ پایا۔ ٹانگوں نے آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ پچھلے چند دنوں سے ٹانگوں میں لڑکھڑاہٹ آچکی تھی۔ کہیں ٹھنڈی چھاؤں دیکھی تو لیٹ گئے اور ٹھنڈا پانی پی کر گزارہ کر لیا، مگر تا بکے۔ ایک دن سروج اپنے پرماتما سے

لُو لگ کر بیٹھ گئی کہ اب اور آگے قدم نہیں اُٹھتا۔ پاؤں میں آبلے پڑ چکے تھے۔ اور وہ پرماتما کی یاد میں ایسی مگن ہوئی کہ پھر نہ اٹھی۔ کال کا سمے آ چکا تھا۔ پران پکشی کایا کے پنجر کو توڑ کر نکل چکا تھا۔ غربت میں۔ بیچارہ ہری چند اکیلا بیٹھا میّت پر زار و قطار رو رہا تھا۔ سروج کی آخری نصیحتوں کو وہ اپنے دل میں بٹھا چکا تھا۔ قہر الٰہی اُس پر نازل ہو چکا تھا۔ اس کے لیے تو یہ قیامت کا سماں تھا۔ پرماتما ایسے دن تو دُشمن کو بھی نہ دکھلائے۔ کہتے ہیں کہ مصیبتیں جب بھی آتی ہیں اکٹھی ہی آتی ہیں۔ پہلے ہی کئی بلاؤں کا نزول تھا۔ اب اس راندۂ درگاہ کی رفیقۂ حیات بھی ساتھ چھوڑ گئی تو اسے زندگی کا ایک ایک پل بھی دُشوار نظر آنے لگا۔ پرماتما کی بارگاہ میں لیٹ کر دُعا کرنے لگا "میرا صرف تیرے پر وشواس ہے۔ اور تو ہی میرے دُکھ دُور کر سکتا ہے۔ تھیں نے درد دیا ہے تھیں دوا دینا۔ بے سہارا لوگوں کا تو ہی سہارا ہے۔ میرے اوپر دیا اور کرم کر اور مجھے اتنی طاقت دے کہ میں اپنی مرحومہ بیوی کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اپنی آخرت سنوار سکوں۔" تہہ دل سے کی ہوئی دُعا جلد منظور ہو جاتی ہے۔ اتفاق دیکھیے ادھر سے ایک ساہوکار کا گزر ہوا۔ دو چار خادم اس کے ہمراہ تھے۔ انھوں نے ہری چند کو میّت کے سرہانے بیٹھ کر روتے دیکھا تو ان کا دل بھر آیا۔ چنانچہ انھوں نے مل کر میّت کو وہیں ٹھکانے لگایا۔ اور ہری چند کو ساتھ لے کر اپنے نگر رام پورہ پہنچ گئے۔ دو تین کوس کا فاصلہ تھا۔ بیچارے ہری چند کو بھی کیا پتا تھا کہ اب پانسہ پلٹنے والا ہے اور قسمت مسکرا رہی ہے:

اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار

نہ ہو اُس سے مایوس امیدوار

سیٹھ نے ہری چند سے سوال جواب کر کے سارے حالات کی جانکاری لے لی۔ اس نے ہری چند کو ٹھہرنے کے لیے جگہ بھی دے دی اور اس کے کھانے پینے کا انتظام

بھی کر دیا۔ علاوہ ازیں اسے اپنے ملازموں کے زمرہ میں شامل کر کے اس کی ڈیوٹی
دیگر ملازموں کے ساتھ اس طرح لگا دی کہ وہ کام کی ٹریننگ بھی لیتا رہے اور سمندری
جہازوں کے ساتھ غیر ممالک جائے جن کے ساتھ اس کے درآمد برآمد کے تعلقات تھے۔
یہ سودا بڑا منفعت بخش تھا اور ایماندار کارکن کی اسے اشد ضرورت تھی۔ اس نے ہری چند
کو پرماتما کی طرف سے بھیجا ہوا سمجھ کر قبول کر لیا اور گلے لگا لیا۔

اتفاق کی بات ہے۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی اس ساہوکار نے سمندری جہاز
دساور کو بھیجنا تھا جس میں اشیائے خوردنی گیہوں، چاول، دال کشمش وغیرہ
جانے تھے اور واپسی پر کچھ مشینری اور ادویات اُدھر سے آنی تھیں۔ چنانچہ اس نے اپنے
پرانے ملازمین سے دو کو اس جہاز میں بھیجنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی ہمارے ہیرو ہری چند
کی ڈیوٹی لگا دی۔ وہ بھی ان کے ہمراہ مقررہ دن اور مقررہ وقت پر پابندی سے بمعہ اپنے
سامان سمندری جہاز میں سفر پر روانہ ہو گیا۔ سفر کوئی بیس پچیس دن کا تھا۔ وہ پہلی بار اپنی
زندگی میں ایسے جہاز پر سوار ہوا تھا۔ اُسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ سمندر کا پانی اور پانی
میں بے شمار قسموں کے جانور تھے۔ چھوٹی اور بڑی قسم کی ہزاروں طرح کی مچھلیاں ان کے
جہاز کے اردگرد پانی میں تیرتی نظر آرہی تھیں۔ ہری چند کو سروج کی نصیحت یاد آگئی کہ
دان دل کھول کر دینا۔ اس نے ایک بوری کشمش کی کھولی اور برتن بھر بھر کر مچھلیوں کو ڈالنے
لگا۔ جہاز کے اردگرد مچھلیوں اور دوسرے سمندری جانوروں کا تانتا لگ گیا اور ہری چند
یکے بعد دیگرے بقایا کشمش کی بوریوں کے منہ کھول کر اسی طرح انھیں ڈالتا گیا۔ ساتھیوں
نے ہر چند باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ کب کسی کی سنتا تھا۔ حتیٰ کہ کشمش کی سب
بوریاں اُن جانوروں کا لقمہ بن گئیں۔ اس کے دماغ پر خیرات کا بھوت اس قدر سوار تھا کہ
ہری چند نے اب اپنا رُخ چاول کی بوریوں کی طرف کیا۔ پہلے کی طرح یہ بوریاں بھی ختم کر دیں۔
تب اسی دُھن میں اس نے گیہوں کی بوریاں بھی ختم کر دیں۔ ساتھیوں کی جب اس نے بالکل پروا

نہ کی تو انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اُسے سمندر میں گرا دیا۔ اب ہری چند سمندر کی لہروں میں غوطے کھانے لگا تو مچھلیاں فوراً اس کے پاس پہنچ گئیں۔ انھوں نے اُسے اپنی پیٹھ پر آرام سے بٹھا لیا اور اسے اپنے سمندر کے راجہ کے پاس لے گئیں اور جا کر اسے بتلایا۔ "سمندر کے راجہ! مہاراج۔ یہ شخص بڑا دھرماتما اور دیالو ہے اس جیسا پہلے کبھی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ نہ ہی کبھی سننے میں آیا ہے۔ ایسا سخی دل انسان تو آپ کے انعامِ خاص کا مستحق ہے۔ اس کے پاس جس قدر کھانے کا سامان تھا وہ تمام کا تمام اس نے ہمیں ڈال دیا۔ اور اس طرح سے ہزاروں جیووں کا دل خوش کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس کے ساتھیوں نے بڑی بے انصافی کی ہے انھوں نے اسے مارنے کے لیے اسے سمندر میں دھکا دے دیا۔ اگر ہم اسے نہ اُٹھاتے تو یہ کب کا واصل بحق ہو چکا ہوتا۔" سمندر کے راجہ نے سمندری جیووں کی سفارش پر ہری چند کو ہیرے اور سچے موتیوں کا ایک جڑاؤ کنگن انعام دیا اور کہا۔ "اے نیک بخت انسان! تو یہ کنگن اپنے مالک کے پاس لے جا۔ اسے کہنا کہ وہ اسے اپنی ریاست کے راجہ کے پاس لے جائے۔ راجہ اسے اس کی اتنی بیش بہا قیمت دے گا جس سے ساہوکار کو اپنے مال کی وہ چند قیمت مل جائے گی اور اسے تم پر ناراضگی کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکے گا۔" سمندر کے راجہ نے از راہِ خوشنودی ہری چند کو اپنے ایک خاص ایلچی کی معرفت آرام اور خیریت سے اس جہاز تک پہنچا دیا جو کہ اس کے دیس کو جانے والا تھا۔ ہری چند کے ساتھیوں نے واپس آ کر ساہوکار کے خوب کان بھرے اور سارے مال کے لٹا دینے کا سارا قصہ اس طرح بیان کیا کہ وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ ساہوکار سیٹھ رادھے شام بڑی بے تابی سے ہری چند کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک دن ہری چند نے اپنا منھ دکھایا۔ اس سے پیشتر کہ سیٹھ اسے ایک لفظ بھی کہے اس نے وہ جڑاؤ کنگن اس کے سامنے کرتے ہوئے سمندر کے راجہ کا تدلیہ بھی دے دیا۔ اگلے ہی دن رادھے شام راجہ کے دربار گیا اور وہ کنگن اسے پیش کر دیا۔ راجہ نے اسے منھ مانگا انعام دیا اور کنگن محل میں جا کر

مہارانی کو تحفہ دے دیا۔

کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ مہارانی راجہ کو کہنے لگی "مہاراج! دیکھیے یہ کنگن میرے ایک ہاتھ میں کتنا سُندر لگ رہا ہے مگر جب تک آپ ایک اور کنگن میرے دوسرے ہاتھ کے لیے لاکر نہیں دیتے میں اسے بھی اتار کر الگ رکھ دوں گی۔" راجہ کو مہارانی کی ضِد کا اچھی طرح پتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی فرمائش کو پورا کیے بنا بات نہیں بنے گی تو اس نے سیٹھ کو طلب کر کے ساری بات اسے سُنائی اور اسی طرح کا ایک اور کنگن لانے کا حکم دیا۔ اور صاف شبدوں میں کہہ دیا کہ اگر تعمیلِ حکم میں کوتاہی ہوئی تو تمھیں ملک بدر کر دیا جائے گا۔ بیچارہ سیٹھ دربار سے یہ حکم سُن کر گرتا پڑتا اپنے گھر پہنچا۔ اس نے آتے ہی ہری چند کو بُلایا اور اسے ساری بات سنائی کہ تمھارا کنگن تو میرے لیے وبالِ جان بن گیا ہے۔ اب اس مصیبت کے وقت تم ہی میری مدد کر سکتے ہو دیگر کوئی شخص اس کام کو سرانجام نہیں کر سکتا۔ مَیں تمھیں پہلے کی طرح پھر جہاز میں مال دے کر سفر پر بھیجتا ہوں۔ تم پہلے کی طرح عمل کرو اور سمندر کے راجہ سے ایک اور اسی طرح کا کنگن لے آؤ تا کہ میری عزت رہ جائے۔"

اب ہری چند کو رادھے شام نے ایک جہاز مال سے بھر کر دے دیا اور اسے سفر پر روانہ کرنے کے لیے خود سمندر تک پہنچا۔ ہری چند نے یاترا کے دَوران پھر اُسی طرح عمل کیا۔ مچھلیاں اور دوسرے سمندری جانوروں کی خوب ضیافت چلتی رہی۔ اب کے بار جہاز میں کوئی اس کا ساتھی نہ تھا اس لیے اس نے مال ختم کرنے کے بعد از خود سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ مچھلیوں نے اُسے پُشت پر بٹھا کر بطریقِ سابق سمندر کے راجہ کے پاس پہنچایا اور اس کی فیاضی و فراخ دلی کی کہانی بیان کی۔ ہری چند نے راجہ اور سیٹھ کی ہوئی بات چیت کا تذکرہ کرتے ہوئے سمندر کے راجہ سے اُسی طرح کا ایک اور جڑاؤ کنگن مانگا۔ سمندر کا راجہ جواب میں کہنے لگا "بیٹا! میرے پاس تو یہ صرف ایک ہی جڑاؤ کنگن تھا۔ جب مَیں ایک دفعہ برہما جی کے دربار میں گیا تھا تو انھوں نے مجھے

دیا تھا۔ دوسرا کنگن تو میرے پاس ہے نہیں وگرنہ میں تمہیں ہرگز مایوس نہ کرتا۔ تمہارے جیسے دانی تو دیکھنے میں کم ہی آئے ہیں۔" ہری چند یہ جواب پاکر وہیں رونے لگ پڑا۔ سمندر کے راجہ کے پوچھنے پر اس نے ساری کہانی بیان کی کہ میرا مالک اور میں راجہ کے حکم کے مطابق ملک بدر ہو جائیں گے اس لیے دوسرے کنگن کی اشد ضرورت ہے۔" سمندر کے راجہ کو یہ بات سن کر ہری چند کی حالتِ زار پر ترس آگیا اور وہ اسے لے کر برہما جی کے دربار پہنچ گیا اور وہاں ساری بات چیت اپنے ہی پیرایہ میں اس طرح بیان کی کہ برہما جی کو انکار کی گنجائش ہی نہ رہی وہ بھی ہری چند کی صفات سن کر اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے ہری چند کو اجازت دے دی کہ سامنے والے کمرے میں بے شمار مال و زر پڑا ہے جس میں کنگن بھی ہیں، تم اپنے مطلب کا کنگن لے لو۔" ہری چند نے جب پہلا ہی کمرہ کھولا تو اس کی حیرانگی کی حد نہ رہی، وہی گیہوں کے دانے جو کبھی روئے زمین پر اس کی بیوی سروج نے ایک سادھو کو دیے تھے، وہاں بکھرے پڑے تھے اور ہری چند نے جب دوسرا کمرہ کھولا تو سروج ایک رتن جڑت جھولے میں بیٹھی جھول رہی تھی۔ سروج نے جب ہری چند کو وہاں دیکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں اور خوشی سے جامہ میں پھولی نہ سمائی۔ بار بار اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کرنے لگی اور اپنے خاوند کو کہنے لگی۔ "پتی دیو! میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ آج آپ کو میں جیتے جی سورگ میں دیکھ رہی ہوں جس کی میرے دل میں تڑپ تھی مگر یہ کام کیسے سرانجام ہوا اس کی وجہ آپکا پنا دیا ہوا دان ہے۔ آپکا دان میرے معمولی دان سے کئی گنا بڑا ہے۔ آپنے میری گزارشات پر تہہ دل سے عمل کیا اور یہ سب اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے پاس ہیں مگر ابھی تمھارا کام پورا نہیں ہوا تم نے واپس زمین پر جانا ہے اور جس غرض سے آئے ہو ابھی اسے پورا کرنا ہے۔ وہ کام کر لو پھر سمادھی لگا کر پوری توجہ سے پرماتما کا نام لینا اور لولین ہو جانا تم یہاں پہنچ جاؤ گے۔ اور ہم ہنسی خوشی یہاں اکٹھے رہیں گے۔" ہری چند نے کنگن اپنے مالک کو دیا جس نے اسے راجہ اور رانی کے پاس پہنچا دیا اور حسب ہدایت

پرماتما کی یاد میں مگن ہو گیا حتیٰ کہ وہ شریر تیاگ کر سورگ دھام میں جا پہنچا:

ساچ برابر تپ نہیں جھوٹ برابر پاپ
جن کے ہردے ساچ ہے تن کے ہردے آپ

(سچ تپ سے بھی بڑا ہے اور سب پاپوں سے بڑا جھوٹ ہے۔ جس دل میں سچائی ہوتی ہے وہیں خود پرماتما بستا ہے۔)

○
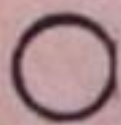
مہاتما مُنشی رام

ایک پُرانی روایت ہے کہ منشی رام ایک کھشتری گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کی ایک اونچے درجے کی کپڑے کی دُکان تھی۔ منشی رام کی ماں بھی ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے پتی اور اپنی اولاد کی سیوا اور دیکھ بھال کی ذمہ داری بطریقِ احسن بھگتاتی تھی۔ دونوں خاوند اور بیوی پرماتما پر پُورا بھروسہ رکھتے تھے۔ ہر روز صبح اور شام باقاعدہ عبادت کرتے، رسادھو مہاتما کی خدمت اپنی طاقت سے بھی بڑھ کر کرتے۔ ست سنگ کا انھیں جہاں بھی پتا چلتا شمولیت کی پُوری کوشش کرتے۔ غریب، یتیم اور بیوہ کی پُوری پُوری مدد کرتے۔ مصیبت اور دُکھ کے وقت ہر ایک کے کام آنا تو ان کا معمول تھا۔ برادری کے لوگ ہر اہم معاملہ پر ان سے ضرور صلاح مشورہ لیتے تھے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ صحیح رائے دیتے تھے۔ اسی لیے وہ عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ غرضیکہ یہ سوبھاگ جوڑی ہمہ صفت موصوف تھی، اور ان کا گھر بہشت کا نمونہ تھا جس کا سہرا زیادہ تر منشی رام کی ماں میرا بائی کے سر پر تھا۔ کسی شاعر نے شاید ایسی ماتا کے ہی لیے کہا تھا:

جس گھر میں ہو ماتا سُمترا سی ؛ اور بھوار ملا سی ہو جہاں
اس گھر کی اُپما کیا کہیے ؛ بس ساکھشات ہے سورگ وہاں

(جس گھر میں ماتا سُمترا جیسی اور بھوار ملا جیسی ہو اُس گھر کی بڑائی لفظوں میں بیان نہیں

کی جاسکتی، وہ گھر تو ارمن جنت کا مزہ دیتا ہے، شریمتی میرابائی اپنے گھر میں اُربلا جیسی بہو لانے کے ہمیشہ خواب دیکھتی رہتی مگر یہ خواب لڑکے کے خیالات کی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ منشی رام کے خیالات پر بھی اپنے نیک والدین کی صحبت اور اُن کے اچھے وچار اور گھر کے خوش گوار ماحول کا اثر پڑنا قدرتی تھا۔ یہ عموماً ایسی ہوتی ہے۔ منشی رام سکول میں بڑی محنت اور لگن سے پڑھتا تھا اور ہمیشہ اپنی جماعت میں اوّل آتا۔ اس کے علاوہ اپنے ساتھیوں اور اساتذہ کے ساتھ اس کا سلوک قابلِ تعریف تھا۔ اس کا شمار سکول کے بہترین طلبا میں ہوتا تھا۔ اور اس نے سب کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ آخر اس نے امتیازی پوزیشن حاصل کر کے انٹرینس کا امتحان پاس کر لیا، مگر پڑھائی کی بجائے اُس کی لگن زیادہ پربھو کے نام کی طرف تھی۔ چھوٹی عمر میں ہی جو مُہر دل پر لگ چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اب اور پکی ہو رہی تھی۔ ایسے خیالات بچّے کے جنم کے ساتھ ہی اس میں ودیعت تھے۔ جوانی میں جب قدم رکھا تو اسے ہر وقت ایک ہی بات کی چنتا رہنے لگی کہ کوئی مُرشدِ کامل مل جائے جو اس کا دھیان پربھو کے چرنوں میں لگانے کے لیے مناسب ہدایات دے تاکہ رُوحانی ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے اپنی آخری منزل تک پہنچ سکے۔ ایسے رہنما بھلا آسانی سے تھوڑے ہی ملتے ہیں۔ بہت عرصہ کی کاہش و کاوش کے بعد اور خونِ جگر پینے کے بعد ہی جا کر کہیں کامیابی ملتی ہے۔ جویندہ یابندہ (تلاش کرنے والا آخر کامیاب ہو ہی جاتا ہے) ایک دن منشی رام کی ملاقات آخر ایک ایسے مہاپُرش سادھو سے ہو گئی جس کی اُسے تلاش تھی۔ پرماتما مسبب الاسباب ہے۔ انسان کی لگن حقیقی ہونی چاہیے:

اگر تو کھٹکھٹائے گا تو کھُل جائے گا دروازہ
بدل جائے گی تیری جستجو آخر حقیقت میں

اس مہاپُرش نے اس نوجوان کے خیالات سُنے اور انھیں پرکھا، جب اس کی پوری تسلی ہو گئی کہ اسے پرماتما کے نام کی سچّی لگن ہے تو انھوں نے منشی رام کو اپنا چیلا بنا لیا۔

منشی رام اُس سادھو کا دل وجان سے گرویدہ ہوگیا اور اس کا چیلا بن کر اس کے دکھائے ہوئے راستے پر نیک نیتی اور خلوصِ دلی سے کاربند ہوگیا۔ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پر بھو بھگتی میں گزارنے لگا۔ گھر اور دکان کے کاروبار سے اسے کیسے دلچسپی ہوسکتی تھی؟ والدین تو یہ سوچتے تھے کہ منشی رام شاید شادی کے بعد سیدھے راستے پر آجائے گا مگر وہ کب ماننے والا تھا۔ وہ تو دُنیاوی بندھنوں سے دُور رہنا چاہتا تھا اور اس کے لیے سیدھے راستے کا مطلب بائی دُنیا سے بالکل انوکھا تھا۔ وہ شادی کے چکّر سے آزاد رہنا چاہتا تھا چنانچہ اس معاملے میں اس نے کسی کی نصیحت پر بھی غور نہ کیا۔ وہ تو علیحدگی میں بیٹھ کر یکسوئی سے صرف بھگوان کی پُوجا کرنا چاہتا تھا۔ اس مطلب کے لیے اُس نے اپنے گاؤں سے کچھ فاصلے پہ تالاب کے کنارے ایک چھوٹی سی کُٹیا بنالی۔ گھر بار چھوڑا نہیں۔ آنا جانا رہتا مگر بہت تھوڑا۔ بعض دفعہ تو وہ دن رات ہی رام سمرن میں لگا رہتا اور کئی لوگوں نے دیکھا کہ منشی رام کو بے خودی میں اپنی بھی کچھ خبر نہ رہتی۔ معرفت کے مشکل راستے پر چلتے ہوئے کئی قسم کے دُکھ اور تکالیف درپیش آتی ہیں مگر اسے کسی بات کی پروا نہ تھی۔ ماں باپ دیکھ کر تنگی ضرور محسوس کرتے تھے مگر بے بس تھے۔ اس کے گاؤں اولڈ فرید آباد کے لوگ اب اُسے مہاتما منشی رام کے نام سے پکارنے لگے۔ جب منشی رام کی ریاضت دو تین ماہ سے اُوپر ہوگئی تو اُس نے ایک رات خواب میں چمکتی ہوئی روشنی دیکھی جسے دیکھ کر وہ کچھ ڈرسا گیا مگر روشنی نے ہی اُس کا حوصلہ بلند کرتے ہوئے منشی رام سے دریافت کیا "اے پریمی بھگت! یہ بتا کہ تُو نے ماں باپ اور رشتہ داروں سے جو قطع تعلق کر رکھا ہے آخر تیرا مقصد کیا ہے؟"

"مہاراج! مجھے سچے پرماتما کی تلاش ہے۔ میرا تو اس دُنیا میں نہ کوئی اپنا ساجن ہے نہ ہی کوئی دُشمن ہے۔ مجھے صحیح راستہ دکھلانے والے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ہی میرا کلیان کردیں تو آپ کی بہت بہت نوازش ہوگی۔ کرپا کر کے ذرا یہ بتا دیجیے کہ آپ ہیں کون؟"

جواب ملا "میں وشنو ہوں۔ تمہیں تمہاری لگن تلاشِ حق کی مبارک ہو۔"

منشی رام گڑ گڑا کر کہنے لگا "مہاراج جی، بھگوان جی! میرا بار بار پرنام ہو۔ اگر آپ واقعی وشنو بھگوان ہیں تو کوئی چھوٹا سا چمتکار دکھلانے کی کرپا تو کیجیے تا کہ میرے چنچل دل کو بھی

تسکین نصیب ہو۔"

"پریمی جی! کچھ ہی عرصہ کے بعد تمھیں پکّا ثبوت مل جائے گا، مگر ابھی نہیں۔" اتنا کہتے ہی وہ روشنی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

اس واقعہ کے چند ہی دنوں بعد مہاتما منشی رام کی طبیعت سخت علیل ہو گئی۔ لہٰذا والدین اسے اُٹھا کر گھر لے آئے۔ سب اچھے اچھے وید اور لڈ فرید آباد کے علاج معالجہ کے لیے اکٹھے ہو گئے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ظاہر طور پر تو بیماری کی کوئی علامت نظر نہ آ رہی تھی۔ مگر ہر وقت غنودگی کا چھایا رہنا باعثِ تشویش ہو رہا تھا۔ غنودگی کی حالت میں منشی رام ایک روز دیکھتا ہے کہ اس کا جنم خانہ بدوشوں کے ایک قبیلہ کے گھر ہوا ہے۔ یہ بالک بڑے ٹھنڈے سُبھاؤ کا ہے۔ اس کا رونا بہت کم ہے۔ ہر کسی کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں اس کا وطیرہ ہر لحاظ سے دل خوش کُن ہے۔ جب یہی بالک ذرا بڑا ہو گیا تو دوسرے لڑکوں کے ساتھ شہر جاتا اور جو چھلنیاں اور درانتیاں والدین تیار کر کے دیتے انھیں وہاں بیچ آتا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اسی لڑکے نے آنکھ بچا کر ایک دُکان سے کانسی کا پیالہ اُٹھایا اور اپنے چادر میں چھپا لیا، دُکاندار نے اس لڑکے کو جس کا نام جھنڈو تھا، بازو سے پکڑ لیا۔ اور حوالۂ پولیس کر دیا۔ پولیس والوں نے دیکھا کہ لڑکا ابھی کمسن ہے، نابالغ ہے، دو چار چپت لگائے اور چھوڑ دیا۔ جرم بھی تو خفیف تھا۔ اسی کے مطابق سزا دینی واجب تھی۔ جھنڈو نے گھر آ کر اس واقعہ کا کسی سے ذکر تک نہ کیا۔ اور بدستور سابق اپنے کام پر لگ گیا۔ انھیں دنوں خانہ بدوشوں کا ایک اور گروہ جھنڈو کے گاؤں میں آ پہنچا۔ یہ دونوں قبیلے آپس میں خوب شیر و شکر کی طرح گھُل مل گئے۔ حتیٰ کہ نو وارد قبیلے نے اپنی ایک لڑکی راجو کی شادی جھنڈو سے کر دی۔ شادی والی رات دونوں کیمپوں میں شراب کے دَور اندھا دُھند چلتے رہے۔ لوگوں کو اپنی سُدھ بُدھ بھی نہ رہی۔ آپس میں کافی شکر رنجی ہو گئی۔ شادی تو کسی نہ کسی طرح سرانجام پا گئی مگر اپنے پیچھے ایسی بدمزگی چھوڑ گئی کہ جھنڈو والے قبیلے کو مجبوراً اُس گاؤں سے ہجرت کرنی پڑی اور وہ کسی اور گاؤں

میں جا بسے ۔ اس نئے گاؤں میں پہنچنے کے دو ماہ کے اندر ہی وہاں ہیضہ کی بیماری بھیانک روپ سے پھیلی جس نے کئی خاندانوں کا صفایا کر دیا ۔ اگلے وقتوں میں حفاظتی تدابیر تو نہ ہونے کے برابر تھیں ۔ جھنڈو کے قبیلے کے کئی افراد ہیضہ کے شکار ہو گئے ۔ اس کی بیوی راجو بھی جانبر نہ ہو سکی ۔ اس قدر تباہی دیکھ کر جھنڈو کا کلیجہ دہل گیا ۔ روتے بیٹتے ایک جنگل کی جانب چلا گیا ۔ وہاں دل نہ لگا تو دوبارہ شہر کی طرف چل پڑا ۔ اُسے کچھ پتا نہ تھا کہ اس کی قسمت اسے کس طرف لے جا رہی ہے ۔ غیب کی باتیں کون جان سکتا ہے ؟ صرف پرماتما پر اٹل وشواس تھا اور اسی کے سہارے وہ زندگی کے دن بسر کر رہا تھا ۔ اتفاق دیکھیے جب جھنڈو شہر کے صدر دروازے پر پہنچا تو رات ہو چکی تھی ۔ اندر سے دروازہ مقفل ہو چکا تھا ۔ بامر مجبوری دروازے کے باہر چادر بچھا کر لیٹ گیا ۔ رات کو اُس ریاست کے راجہ کی ناگہانی مَوت ہو گئی ۔ امیروں وزیروں نے میٹنگ بلائی اور فیصلہ کیا کہ کل علی الصباح شہر کے صدر دروازے کو کھولنے پر جو اجنبی شخص سب سے پہلے نظر میں آجائے اُسے ہی پرماتما کا بھیجا ہوا تصور کرتے ہوئے راج تخت پر بٹھا دیا جاوے ۔ اس فیصلہ کے مطابق جب دروازہ کھولا گیا تو ان کی نظر جھنڈو پر پڑی ۔ لوگوں نے انھیں بڑی عزت دی ۔ جھک جھک پرنام کیا ۔ کوئی پاؤں چھونے لگا ۔ جھنڈو اپنی جگہ پر حیران تھا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے ۔ آخر انھوں نے جھنڈو کو سب کچھ بتلا دیا ۔ معززین اسے بصد تعظیم و تکریم جلوس کی صورت میں شاہی محل تک لے آئے ۔ سارے لمبے راستے میں اُس پر پھولوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی ۔ لوگوں کا جمِ غفیر ہو گیا ۔ راجہ نے اپنا نام جھنڈو بتلایا تو لوگوں نے "جھنڈو رام زندباد ۔ جھنڈو رام امر رہے ۔ راجہ جھنڈو رام دائم سلامت رہے" کے فلک شگاف نعرے لگائے ۔ ساری ریاست میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی کے چراغ جلائے گئے ۔ قسمت اس پر مسکرا رہی تھی ۔ اور وہ حیران ہو رہا تھا ۔ من ہی من میں سوچ رہا تھا :

خُدایا کون ہے ثانی تیرا سارے زمانے میں
اشارہ تیرا کافی ہے گھٹانے اور بڑھانے میں

اب راجہ جھنڈو رام نے ایک شاہی مہر بنوائی کہ شاہی احکام و فرمان پر حسبِ ضرورت لگائی جایا کرے۔ خود تو محض اَن پڑھ تھا۔ ریاست کے معزز ترین ٹھاکر خاندان کی ایک لڑکی جس کا نام منورما تھا، سے راجہ کی شادی ہوگئی۔ منورما حسن و ملاحت کی تصویر تھی۔ بڑے خوب صورت خدوخال کی یہ نازک سی لڑکی اپنی مثال آپ تھی۔ اس کی متوالی چال اور سحر انگیز آنکھیں جادو کا اثر رکھتی تھیں۔ رات کو روزانہ محفلِ رقص و طرب سجائی جاتی۔ رقاصانِ دلنواز اپنا اپنا جوہرِ کمال دکھاتے۔ گروپ ڈانس کا نظارہ بڑا ہی دل کش ہوتا۔ رسیلی تانوں پر تالیوں کا تلاطم برپا ہوتا۔ ہر طرف سے "مرحبا، مرحبا" کے نعرے بلند ہوتے گویا کہ اِندر کا اکھاڑا سجا ہوا ہو۔ جھنڈو رام کے آٹھ دس سال حکومت کے خوشی خوشی گذر گئے۔ اور وہ سب پرانی باتیں بھول گیا۔

ایک دن ایک معمولی واقعہ درپیش آیا مگر اس کے نتائج بڑے دُور رس تھے۔ راجہ کو بھی کیا پتا تھا کہ اب عنقریب تنزلی کے دن آ رہے ہیں۔ مقدر کا لکھا تو ملنا ہی ہے۔ کسی کے سب دن برابر نہیں جاتے:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دھوکہ دیتے ہیں یہ بازی گر کھلا

راجہ ہاتھی پر سوار تھا جس کا ہودج و دیگر ساز و سامان طلائی و نقرئی تھا۔ امیر وزیر گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور یہ سب سیر کی غرض سے شہر کے باہر جا رہے تھے۔ شتر سواروں نے زرق برق وردیاں پہن رکھی تھیں۔ عجب چہل پہل کا سماں تھا۔ تھوڑی ہی دُور گئے ہوں گے کہ سامنے سے آتا ہوا خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ آ نکلا۔ اس قبیلے کا سردار بڑا ہوشیار اور سمجھ دار تھا۔ جب اس کی آنکھیں راجہ سے چار ہوئیں تو اس نے پہچان لیا کہ یہ راجہ تو جھنڈو ہے جو ہماری برادری کے فلاں شخص کا لڑکا ہے۔ وہ فرطِ مسرت سے اُچھل پڑا۔ ساتھیوں کو

سمجھانے لگا۔" بھائیو! میں نے راجہ بہادر کو قریب سے دیکھا ہے یہ تو جھنڈو ہے جو کرموں کا لڑکا ہے۔
اور راموں کا داماد ہے۔ اُس کی بیوی راجو کی موت ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں ایسے کچھ دھندلے
سے نقوش ہیں۔ ہمارے لیے خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے خاندان کا ایک فرد اس ریاست کا حکمران ہے،
اب تو اس کے اختیارات لامحدود ہیں۔ مجھے امید واثق ہے کہ اگر ہم راجہ صاحب سے اپنے خاندان کے لیے
کوئی بھی رعایت مانگیں تو وہ ضرور نظر کرم کرے گا۔ آپ صاحبان اپنے اپنے وچار بتائیے۔" قبیلے
کے دو بزرگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔" سردار صاحب! ہمیں بھی راجہ کو دیکھ ایسا
معلوم ہوا کہ یہ جھنڈو ہے۔ مگر ہم تمہارے ساتھ اس بات میں اتفاق نہیں کر سکتے کہ ہم کسی چیز
کے لیے اس سے التجا کریں۔ اور اگر بفرضِ محال اس نے کوئی مہربانی کر بھی دی تو ہم ہمیشہ کے
لیے اس کے غلام ہو گئے اور وہ ہمارا آقا ہو گیا۔ ہر وقت اپنا احسان جتائے گا جدھر بھیجے گا،
ہمیں جانا پڑے گا۔ جو کام کہے گا کرنا پڑے گا گویا کہ ہم اپنی آزادی کو بیچ کر غلامی کا پھندا اپنے
گلے میں ڈال لیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمیں پرماتما نے ہاتھ پاؤں دیے ہیں۔ جس طرح پہلے اپنا
گزارہ کرتے آئے ہیں، اب بھی کر لیں گے۔ آزادی کی زندگی کیوں چھوڑیں؟ اور غلط فہمی
میں نہ رہنا۔ اول تو وہ آپ کو پہچاننے سے ہی انکار کر دے گا جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے۔ بڑے آدمی اپنے غریب رشتے داروں کو
اکثر پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور اگر وہ پہچان بھی لے تو ہمیں کیا دے دیگا۔ کیا اُس سے آپ کی ساری زندگی ٹھیک
ڈھنگ سے گذر جائے گی؟" قبیلے کے سردار کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا قبیلے کے دوسرے اشخاص بھی ان
دو بزرگوں کی بات میں جان سمجھ رہے تھے اس لیے سردار نے سب کو آگے چلنے کا اشارہ کر دیا۔

راجہ نے بھی قبیلہ کے چند اشخاص کی باہمی بات چیت سن لی۔ خوب سمجھ رہا تھا کہ انھوں
نے تو آج لٹیا ہی ڈبو دی۔ اُس کو آنے والے حوادث کا سایہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اپنے آپ
کو سمجھانے لگا۔" اے جھنڈو! تو حوادثِ آزمائش سے مت رنجور ہو! دنیا میں توام ہے شادی و
غم۔ کوئی اچھے کرم کیے تھے تو حکومت ملی اور وہ بھی بغیر کسی محنت کے۔ اب اگر کوئی مصیبت
آئے گی تو وہ بھی کرموں کے انوسار آئے گی۔ دُکھ گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہر دکھ سکھ

کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا ہی واجبی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حاضرین میں سے کسی نے بھی اُن لوگوں
کی بات سنی ہی نہ ہو۔ مترس از بلا کہ شب درمیاں ست (رات ابھی بیچ میں ہے اس لیے
آنے والی بلا سے اس وقت ڈرنا بے معنی ہے) آنے والے واقعات کا انتظار کرنا چاہیے۔"
اس طرح سے دل کو بہلاتا ہوا آخر وہ اپنے محل جا پہنچا۔ جلد ہی راجہ کو پتا لگ گیا کہ قبیلے
کے لوگوں کی باتیں شہر کے چند معززین نے بھی سُن لی ہیں۔ ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ ٹھاکر رپودمن
سنگھ نے جلسہ میں بڑا دھواں دھار تقریر کی۔ جس طرح ہوا کا رُخ پتنگ کے رُخ کو بدل دیتا ہے
اسی طرح ٹھاکر کی تقریر نے سب سامعین کے دلوں پر گہرا اثر کیا۔ وہ کہنے لگا۔" بھائیو!
آج ایک ایسی بات میرے سُننے میں آئی ہے جس کا ہمیں پہلے کبھی خواب و خیال بھی نہ تھا۔
خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ جلوس کے سامنے آیا تھا۔ میں راجہ کے قریب تھا۔ قبیلہ کے لوگوں
کی سب بات چیت میں نے سُن لی۔ وہ ہمارے راجہ کو اپنے قبیلے کا فرد بتا رہے تھے۔ مجھے
ان کی بات پر شک کرنے کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ ہمارا راجہ ایک خانہ بدوش خاندان
سے ہے۔ چھوٹی جاتی کا ہے۔ راجہ کے ساتھ امیر وزیر اکثر کھانا کھاتے رہے ہیں۔ پھر یہ
امیر وزیر اپنے گھر والوں کے ساتھ اور دوستوں یاروں کے ساتھ کھانا کھاتے رہے ہیں۔
اس طرح سے اس چھوت کی بیماری سے ہر خاص و عام متاثر ہوا ہے۔ کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ
امیروں وزیروں سے ہمارا کبھی میل ملاپ نہیں ہوا؟ یہ سب کچھ ہمارے دھرم کے اُلٹ ہوتا رہا
ہے۔ ہمارا دھرم بھرشٹ ہو چکا ہے۔ اب آپ کو اُن سب سے میل جول اور اکٹھا بیٹھ کر کھانا یکسر
بند کر دینا چاہیے۔ گذشتہ را صلوٰۃ، آئندہ را احتیاط۔ (جو کچھ لاعلمی میں ہو گیا، ہو گیا، مگر
آئندہ تو ہمیں پوری پوری احتیاط کرنی چاہیے) ہماری جاتی کا بڑا ایمان ہوا ہے۔ مذہب
خطرے میں ہے۔ اِسے بچانے کے لیے ہمیں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی ہرگز دریغ
نہیں کرنا چاہیے۔ نہیں تو سمجھ لو کہ ہم دُنیا سے بھی گئے اور دین سے بھی گئے۔ قرب و جوار کی
ریاستوں کے لوگ ہم پر لعنت بھیجیں گے۔ سمجھ لو کہ نرک کے دروازے ہمارے لیے کھُل چکے

ہیں۔ پشچاتاپ اور وہ بھی فوری ایک ہی علاج رہ گیا ہے۔ اس پرائشچت کے لیے ہمارے پروہت پنڈت جے چند جی آپ کو تجویز بتائیں گے۔ اتفاق سے ہمارے محترم وزیر صاحب بھی یہاں جلسہ میں رونق افروز ہیں۔ ان کے خیالات بھی ذرا سُن لیجیے۔" وزیر بادلِ نخواستہ اٹھا اور اس نے حاضرین کو یوں مخاطب کیا! "میرے بھائیو اور بزرگو! آپ نے ٹھاکر صاحب کے خیالات ابھی سنے، مگر میں ان کے خیالات سے ہرگز متفق نہیں ہوں۔ سُنیے ہمارے راجہ بہادر بیشک خانہ بدوش خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، مگر اس سے ہم لوگوں پر کیا اثر پڑتا ہے؟ جب ہمارے پہلے راجہ صاحب کی موت ہوئی تھی تو پنچایت نے ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ کل سویرے شہر کے دروازے پر جو اجنبی شخص سب سے پہلے نظر آئے گا، وہی ہمارا راجہ ہوگا اور اسے پرماتما کا بھیجا ہوا سمجھ کر سویکار کر لیا جائے گا۔ کیا اس پنچایت میں ہمارے ٹھاکر صاحب شامل نہیں تھے؟ کیا اس وقت رنگ رُوپ یا مذہب کی کوئی پابندی لگائی گئی تھی؟ اگر نہیں لگائی گئی تھی تو آج پنچایت اپنے پرانے فیصلے سے کیوں منحرف ہو رہی ہے؟ ہمیں کسی کے دھرم سے کیا؟ ہمیں تو راجہ بہادر کی نیک صفات کو مدِّ نظر رکھنا چاہیے۔ ان کو راج کرتے ہوئے آٹھ دس سال ہو گئے ہیں۔ ذرا دیکھیے انھوں نے رفاہِ عامہ کے لیے کتنے سکول اور ہسپتال بنوائے ہیں۔ نئی سڑکوں کی تعمیر پر زرِ کثیر صرف کیا ہے۔ ہر مذہب کے لوگوں کو پُوری پُوری مذہبی آزادی حاصل ہے۔ جان و مال کی حفاظت کو وہ سب سے مقدم فرض سمجھتے ہیں۔ رعایا کتنے پیار سے بلا امتیازِ مذہب و ملت آپس میں بھائیوں بھائیوں کی طرح مل جُل کر رہتی ہے۔ جرائم بہت کم ہوتے ہیں کیونکہ مجرم کو سزا سخت ملتی ہے۔ راجہ کا دربار ہر وقت کھُلا ہے۔ پنچایتیں اپنا اپنا کام ٹھیک ڈھنگ سے چلا رہی ہیں۔ کھیتی باڑی اور کاروبار میں ان آٹھ دس سالوں میں کتنی ہی ترقی ہوئی ہے۔ ساتھ کی دوسری ریاستوں سے ذرا مقابلہ کر کے دیکھیے تو آپ کو سب کچھ روشن ہو جائے گا۔ مَیں کہاں تک اس راج کے سُکھ گنا تا جاؤں۔ ہمیں تو راجہ بہادر کی ذات کے گُن دیکھنے چاہئیں۔ راجہ صاحب سرکاری خزانے سے اپنی ذات پر صرف کرنے کے لیے

ایک روپیہ تک نہیں لیتے۔ اب میں مذہب اور چھوا چھات کے متعلق بھی چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں چھوا چھات جہالت کی نشانی ہے۔ تمام انسان ایک جیسے سلوک کے حقدار ہیں۔ بڑے بڑے پرسدھ بزرگوں کے حوالے سے میں چند شبد کہنا چاہتا ہوں۔ بابا گورو نانک دیوجی نے فرمایا ہے: "نانک اُتم نیچ نہ کوئے" (انسان جنم کی وجہ سے چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا بلکہ اپنے کاموں کی وجہ سے چھوٹا بڑا ہوتا ہے۔) بھگت کبیر داس کے وچار بھی سنیے:

اِک نُور تے سب جگ اُپجیا

کون بھلے کون مندے

(پرماتما نے سب لوگوں کو ایک ہی روشنی سے پیدا کیا ہے۔ اس لیے جنم کی وجہ سے کوئی امتیاز اچھے بُرے کا نہیں ہونا چاہیے) انسان کو انسان ہی سمجھنا چاہیے۔ خواہ وہ کسی مذہب کا ہو۔ انسان کی پرکھ اس کے اعمال و کردار سے ہونی چاہیے۔ اچھوتوں کے حقوق اب انھیں آہستہ آہستہ مل رہے ہیں۔ سکول اور مندر اب سب ان کے لیے کھل رہے ہیں۔ انھیں حقارت آمیز نگاہوں کا نشانہ بنانے سے باز رہو۔ ان کا بھلا قصور کیا ہے؟ آپ تو ان ہریجنوں کے ساتھ لگنا بھی نہیں چاہتے۔ آپ کا واحد جواب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ مَیلا وغیرہ اٹھاتے ہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ اس مَیلا کے ذمہ دار کون ہیں، آپ لوگ یا وہ لوگ؟ وہ تو صفائی کرتے ہیں اس لیے ان کا ہمارے اوپر بڑا احسان ہے۔ ان کو موردِ الزام ٹھہرانے میں آپ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والی بات کرتے ہیں۔ اگر شہر میں صرف دو چار دن ہی صفائی نہ ہو تو جگہ جگہ گند کے انبار لگ جائیں۔ ہر طرف سے بدبُو آنی شروع ہو جائے تو ہاہا کار مچ جائے۔ اور کئی قسم کی بیماریاں نمودار ہو جائیں تو آپ لوگوں کا دماغ ٹھکانے پر آجائے۔ اور ان برہمنوں اور ٹھاکروں کو بھی دال آٹے کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔ میرے خیال میں نہ تو راجہ بہادر کا کسی قسم کا بائیکاٹ کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی قسم کے پرائشچت کی ضرورت ہے۔ میں علانیہ کہہ رہا ہوں کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب چھوا چھات

جیسے مہان پاپ اور نارو اظلم کا قلع قمع کرنے کے لیے سماجک لیڈر اور ریفارمر میدان میں آئیں گے مجھے یہ تو پتا نہیں کہ میں اور آپ وہ وقت دیکھ سکیں گے یا نہیں۔ انسان کی اچھائی اور برائی کا امتحان اس کے کرموں سے ہے نہ کہ اس کی ذات سے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

جو پوچھے جائیں گے محشر میں وہ اعمال ہیں تیرے
اگر کچھ ساتھ جائیں گے وہ نیک افعال ہیں تیرے

راجہ کو دُنیا پرماتما کا سایہ کہتی ہے، اور ہمارا راجہ تو کئی صفات سے متّصف ہے، اخلاقِ فاضلہ کا بہترین نمونہ ہے۔ بامقصد نیک زندگی بسر کرتا ہے۔ ہر وقت کرم و رحمت پر اس کی نظر رہتی ہے کہ رعایا حفاظت سے بیٹھ سکے۔ نوشیروانِ وقت ہے۔ پر اُپکار (دوسروں کی بھلائی) اور پر سیوا (دوسروں کی خدمت) کو مکھ رکھتا ہے، کارِ ثواب اس کی زندگی کے اٹوٹ جزو ہیں۔ اگر معترضین راجہ بہادر کی ان اچھائیوں کو نہیں دیکھ سکتے تو اس میں کس کا قصور ہے:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

(اگر چمگادڑ کی آنکھ دن کے وقت دیکھنے سے قاصر ہے تو سورج کا بھلا اس میں کیا قصور ہے؟) اس سٹیج پر لوگوں نے وزیر پر کچھ آوازے بھی کسے اور پھبتیاں بھی اڑائیں لیکن نمک حلال اور راست گو وزیر نے پھر بھی اپنی تقریر جاری رکھی۔ کہنے لگا۔ "ذرا غور فرمائیے۔ ہمارے راجہ بہادر کی شادی بھی تو ریاست کے معزز ترین ٹھاکر خاندان میں ہی ہوئی ہے۔ اُس وقت ہمارے نیتا ٹھاکر ریودمن سنگھ جی کہاں گئے ہوئے تھے؟ اس وقت تو کسی نے بھی راجہ بہادر کی ذات کی تصدیق کی ضرورت محسوس نہ کی۔

چڑھتے سورج کی ہر کوئی پرستش کرتا ہے۔ بھائیو! میری مخلصانہ رائے تو یہ ہے کہ ہمیں کوئی سخت قدم اٹھانے سے پہلے معاملے کے سبھی پہلوؤں پر بڑے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس لیے موزوں التوا ضروری ہے۔ آپ سب سمجھدار ہیں۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔ کیونکہ اکثر کہا جاتا ہے کہ آوازہ خلق کو نقّارہ خدا سمجھو۔"

وزیر آج جب گھر سے نکلا تھا تو اسے کچھ بدشگونیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، وہ سمجھ چکا تھا کہ کوئی بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ تقریر کے دَوران پہلے تو کبھی "بند کرو، بند کرو اور بیٹھ جاؤ!" کے نعرے بلند نہیں ہوئے تھے۔ آنے والے واقعات کا کچھ پہلے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی باتوں سے صاف پتا چل رہا تھا کہ ماحول کافی بگڑا ہوا ہے۔ طوطی کی آواز نقّارخانہ میں کون سُنتا ہے۔ وزیر نے مصلحت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے وہاں سے کھسک جانا ہی موزوں سمجھا۔ رفوچکر ہو گیا۔ تیزی سے چلتا ہوا راجہ کے پاس پہنچا اور اسے بتلایا کہ کیا ہنڈیا پک رہی ہے، اور یہ دھرم کے محافظ اور ٹھیکیدار کوئی نیا گُل کھلانے والے ہیں۔ راجہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ رائے عامّہ کے سامنے بھرنا کارے دارد والا معاملہ نظر آرہا تھا۔ وہ تو بڑا نیک نفس انسان تھا۔ اگر وزیر نہ تھامتا تو شاید راجہ پچھاڑ کر زمین پر ہی گر پڑتا۔ سوچنے لگا کہ کتنا بھیانک سماں ہوگا کہ شہر کی تمام آبادی جل کر خاکستر ہو جائے گی۔ اس کی تمامتر ذمّہ داری اکیلے راجہ پر ہی ہوگی۔ یومِ حساب اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے وہ کون سے مُنہ سے جائے گا۔ راجہ کے من میں طرح طرح کے خیالات اُبھر رہے تھے کہ کیوں نہ میں ہی اکیلا شہر چھوڑ کر خاموشی سے کہیں بھاگ جاتا۔ یہ معصوم اور بے گناہ لوگ تو زندہ رہ جاتے۔ ان سب کی بے وقت مَوت کی ذمّہ داری میرے اکیلے کے سر پر ہے۔ مگر بیچارہ بے بس تھا۔ اسی اُدھیڑ بُن میں کافی دیر لگا رہا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مجبوراً سب کچھ قدرت پر چھوڑ کر اپنی و رعایا کی بہتری کے لیے پرارتھنا کرنے لگا۔ دُنیا کا قاعدہ بھی یہی ہے کہ جب سب طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے تو پرماتما کے نام کا سہارا

لیا جاتا ہے۔ ادھر اسٹیج پر بولنے کی اب ریاست کے مکھیہ پروہت کی باری تھی۔ پنڈت جے چند بڑا ودوان بزرگ تو تھا مگر ساتھ ہی بڑا شاطر اور چالباز تھا۔ اس میں اچھی صفتیں بھی بدرجۂ غایت موجود تھیں۔ کچھ ہی عرصے پہلے اُس نے راجہ کے ساتھ اقتدار کی جنگ میں شکست کھائی تھی اور اُسے بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ اس کا دوسرا ساتھی ٹھاکر رپودمن سنگھ جو پہلے اپنی بس بھری تقریر کر چکا تھا کبھی ریاست کی ایک برگزیدہ ہستی تھی۔ اسے راج دربار میں بڑا دخل حاصل تھا۔ وہ راجہ کے خیرخواہوں کی لڑی میں پرویا ہوا تھا مگر اپنی چند ناپسندیدہ حرکتوں کی وجہ سے اب راجہ کی نظروں سے گر چکا تھا جیسا کہ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے ایسے مفسد لوگ اپنی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کچھ سادہ لوح لوگ ساتھ ملا لیتے ہیں اور اپنی پارٹی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہی حال ان دونوں بزرگوں کا تھا۔ راجہ سے انتقام لینے کی خاطر یہ شکستوں کے یہ غلام اندر ہی اندر کھچڑی پکا رہے تھے کہ انھیں یہ نادر موقعہ ہاتھ آگیا۔ دل کا بخار نکالنے کے لیے انھوں نے آج کے موقعہ کو غنیمت جانا۔ وہ اس پرانے اصول پر عمل کر رہے تھے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ ایک اور بات بھی دھیان میں رکھنے کے لائق ہے، وہ یہ کہ قدرت کے نیم اٹل ہیں۔ عروج کے بعد تنزلی اور تنزلی کے بعد عروج۔ راجہ ترقی دیکھ چکا تھا اب اس کی تنزلی کا وقت آچکا تھا۔ اسے روکنا اس کے بس کا نہ تھا سبب بھی اسی طرح کے بن رہے تھے۔ پنڈت جے چند سفید موٹے کھدر میں ملبوس اُوپر گاڑھے کھدر کی ہی چادر لیے ہوئے اسٹیج پر آیا۔ پہلے اُس نے دھرم کا جھنڈا لہرایا۔ پانچ بار دھرم کا جیکارہ بلایا۔ دھرم کی جے ہو۔ اُدھرم کا ناش ہو، کے نعرے لگائے۔ لوگوں نے بھی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ تب اُس نے اپنی اشتعال انگیز تقریر کا یوں آغاز کیا۔ اسے کہتے ہیں منہ میں رام رام، بغل میں چھری۔

"بھائیو، بہنو، ماتاؤ اور بزرگو! آپ نے ٹھاکر صاحب کے خیالات سُنے۔ وزیر کا

تردید پیتانیبھی سن لیا اور آپس میں بھی سوچ بچار کرلیا میرا یہ پختہ یقین ہے کہ آپ لوگ صحیح نتیجے پر پہنچ چکے ہوں گے کہ ہمارا دھرم بھرشٹ ہو چکا ہے اور اس کا علاج بھی جلد از جلد ہونا ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری زندگی فانی ہے، چند روزہ ہے ہر ایک کا دھرم الگ الگ ہے جس کی حفاظت کرنا ہر ایک کا فرض اولین ہے۔ دھرم ہی سب کچھ ہے۔ دھرم کی حفاظت کے لیے پرانے زمانہ میں بھی کئی دھرم یدھ ہوئے۔ کیا ہم اپنے بزرگوں کی روایات کو برقرار نہیں رکھیں گے؟ راجہ ہرش چندر نے دھرم کے نام پر سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ دنیا میں آپ کو عام طور پر دو قسم کے انسان ملیں گے۔ بہادر اور بزدل۔ بہادر انسان تو زندگی میں صرف ایک ہی بار مرتا ہے جب کہ بزدل انسان کی موت کئی دفعہ ہوتی ہے دھرم کے نام پر مر مٹنے والا ابدی زندگی پاتا ہے۔ سورگ کے دروازے اُس کے لیے کھل جاتے ہیں اور تاریخ میں بھی اس کا نام سنہری حرفوں سے لکھا جاتا ہے۔ آج ہمارے امتحان کا وقت ہے بتلائیے آپ بہادر کہلانا پسند کریں گے یا بزدل؟" ہر طرف سے آوازیں آئیں "ہم بہادر ہیں، بہادر بن کر دکھا دیں گے۔ ہمارا واحد مذہبی نیتا پنڈت جے چند ہے! ٹھاکر صاحب زندہ باد!" پنڈت نے تقریر جاری رکھی "صاحبان! اگر ہم نے آج مذہبی فرض میں کچھ کوتاہی یا ڈھیل دکھلائی تو آئندہ نسلیں اور ہمارے ہمسایہ ریاستوں کے سب باشندے ہم پر لعنتیں بھیجیں گے، جو ہم کسی قیمت پر سننے کو تیار نہیں ہیں۔ جان جائے پر دھرم نہ جائے۔ میں چند شبدوں میں وزیر کی بھی قلعی کھول دینا چاہتا ہوں۔ بیشک وہ جہاندیدہ اور سمجھدار ہے مگر اس نے ہم سب کو بدھو بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ مطلب پرست ہے۔ اہل غرض ہے اور ابن الوقت ہے۔ اُسے تو صرف اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔ دھرم اس کے لیے ہیچ ہے۔ اس کی اپنی گدی ڈانواں ڈول نہیں ہونی چاہیے۔ رعایا اور رعایا کا دھرم جائے بھاڑ میں۔ اُسے راجہ کی قومیت کا جب پتا تھا تو اس نے اسے آج تک کیوں صیغۂ راز میں رکھا؟ راجہ ان پڑھ ہے۔ وزیر کے پاس ریاست کے راجہ کے تفویض شدہ کلی اختیارات ہیں۔ ہر معاملے میں وہ اپنی مرضی چلاتا ہے۔ ان کی ملی بھگت ہے۔ آج تک وہ دونوں بغیر کسی رکاوٹ کے ایک خطرناک کھیل کھیلتے رہے ہیں۔

اب اس کے سدِ باب کا وقت آگیا ہے، وزیر خوشامد درآمد سے آج تک کرسی سے چمٹا رہا ہے۔ اپنی تقریر کے دوران اُس نے راجہ کی صفتوں کے پُل باندھتے ہیں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ ریاست میں چوری کی وارداتیں اور کئی دیگر جرائم اکثر سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں عالم پور گاؤں میں زمین داروں نے اپنے ہی مزارعین کے رہائشی گھروں کو آگ لگائی تھی۔ بیشمار غریب لوگ محنت مزدوری کرنے کے باوجود رات کو بھوکے پیاسے سوجاتے ہیں۔ کسی سرکاری اہل کار کو ان کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اقتصادی نقطۂ نگاہ سے ہماری ریاست کافی پچھڑی ہوئی ہے۔ بیوپار کافی دنوں سے ٹھپ ہو رہا ہے۔ کئی سنستھاؤں نے ان امور کی جانچ پڑتال کی مانگ کی مگر یہ سب راجہ اور وزیر کے بہرے کانوں پر پڑی۔ وہ جانچ پڑتال کے نام سے ہی ڈرتے ہیں۔ انھوں نے آپ ہی بتائیے اپنے عہدِ حکومت میں کون سا تیر مارا ہے؟ آپ صاحبان اپنے تاثرات بتلانے کی ذرا کرپا کریں گے؟" آوازیں: "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، پنڈت جی زندہ باد۔" پنڈت جی نے جوش و خروش دیکھ لیا۔ لوگوں کی نبض خوب پہچانتا تھا، سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا: "بھائیو اور بہنو! مجھے آج تک اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ آپ لوگ راجہ کے نام سے کانپتے کیوں ہیں۔ کیا وہ کوئی دیوتا ہے؟ ہمارے جیسا ایک عام انسان ہی تو ہے۔ جو ہماری طرح ہی پیدا ہوا اور ہماری طرح ہی مرے گا۔ کتنے بڑے بڑے راجے مہاراجے ہو گذرے ہیں سب اپنی اپنی موت مر گئے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا راجہ موت کی دست بُرد سے بچ جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ میں نے راجہ کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ دو چار ماہ ہوئے وہ بخار کی زد میں آگیا بُری طرح سے کراہ رہا تھا۔ اس کا اپنا اور اس کے حاذق طبیبوں کا کچھ بس نہ چلا۔ اگر وہ بیماری کو روک سکے تو میں جانوں۔ آپ لوگوں نے اسے طرح طرح کے القاب دے رکھے ہیں۔ کوئی گیتی پناہ کہتا ہے تو کوئی مہاراج ادھیراج اور ہمارا وزیر تو اسے ایشور کا سایہ کہتا ہے۔ بتائیے آپ لوگ اب کیا کہتے ہیں؟ دھرم کو عزیز سمجھتے ہیں یا اپنی جان کو؟" جواب: "دھرم ہمیں

دنیا کی ہر چیز سے پیارا ہے۔" پنڈت بولا "میری تو پرماتما سے یہی دعا ہے کہ وہ وزیر کو ست بدھی بخشے"
لوگوں نے پنڈت کے نام کے خطبے پڑھے اور اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔
پنڈت جے چند کو لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور وہ ایک چرب زبان مقرر تھا۔ اس میں وہ تمام صفتیں موجود تھیں جو ایک اچھے "مقرر" میں ہونی چاہئیں۔ اس میں ذاتی عیوب نہ تھے۔ فقط نیک ہونا ہی اس کی بھاری سفارش تھی۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو راجہ کے خلاف ابھارا۔ مذہبی جنون، دھرم کا واسطہ، نرک اور سورگ سب کو اپنی تقریر میں گھسیٹا۔ نرک کی صعوبتوں کے نظارے اس طرح کھینچے گویا وہاں کا ہی رہنے والا ہو۔ کئی مذہبی کتابوں کے حوالہ جات دیے۔ بھلا کون سمجھنے والا تھا کہ یہ مستند ہیں یا غیر مستند۔ کئی منتر پڑھ پڑھ کر سناتا رہا۔ اس کی تقریر کے سامنے وزیر کی تقریر ماند پڑ گئی۔ تمام لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہے۔ ہر طرف خاموشی کا عالم طاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگ بت بنے بیٹھے ہیں۔ تقریر کے دوران اگر کبھی کوئی آواز آتی تھی تو "مرحبا مرحبا! پنڈت جی زندہ باد، ٹھاکر جی زندہ باد" ہی سنائی دیتا تھا۔ جے چند کا نام تو ہماری تاریخ میں پہلے آ ہی چکا ہے۔ آج کے پنڈت جے چند نے بھی اپنا پارٹ خوب نبھایا۔ اندھ وشواس اور اگیانتا کا زمانہ تھا۔ پنڈت کی تقریر اپنا رنگ لائی۔ ساری تقریر میں ظالم پنڈت نے اس طرح لوگوں پر سوالات کیے کہ انھیں ہاں کہنے کے بغیر اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ آخر میں اس نے سب سے ضروری سوال پوچھا "اب آپ بتائیے کہ دھرم کے بھرشٹ ہونے کی وجہ سے ہمیں پرائشچت کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ دھرم کوئی میرے اکیلے کے لیے تو مقدس نہیں ہے۔ میں آپ میں سے ایک ہوں۔ آپ کا فیصلہ میرے لیے آخری بات ہوگی" لوگوں کے نمائندہ نے کھڑے ہو کر کہا "پوجیہ پنڈت جی! سچ سچ آج تو آپ نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ ہم آپ کی ہر بات پر پھول چڑھائیں گے۔ ہم دھرم کی بے عزتی ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ آپ جلد اپنی تجویز بتلائیے۔ ہم دھرم کے نام پر بڑے سے بڑا بلیدان دینے کو تیار ہیں" پنڈت کی

تقریر کا جادو اچھی طرح چل گیا تھا۔ ہر ذی رُوح کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے مگر اب یہ ان پڑھ لوگ جانیں بچھاور کرنے پر رضامند ہو گئے تو پنڈت جی نے یوں لب کشائی کی۔ "بھائیو، اور بہنو! میری تجویز یہ ہے کہ آج آپ سب مل کر محل کے ساتھ والے سوکھے تالاب کو لکڑیوں سے خوب بھر دو اور آگ لگا دو۔ بعد ازاں بلا امتیاز مذہب و ملّت ہر ذی رُوح مرد ہو یا عورت یا بچہ "سب دھرم کے نام پر" آگ میں چھلانگیں لگا کر اپنی جانیں دے دو۔ ہم لوگ سب سے پہلے جانیں دیں گے۔ اس طرح سے ہم امر ہو جائیں گے، اور ہمارے سب پاپ دُھل جائیں گے۔ آپ عالمِ فنا سے عالمِ بقا کی طرف جا رہے ہو۔ ہنسی خوشی جاؤ اور اپنے گھروں سے اس کارِ خیر کی تکمیل کے لیے جلد از جلد تالاب پر پہنچو۔ ٹھاکر جی اور میں وہاں آپ کے سواگت کے لیے موجود ہوں گے۔ یاد رکھیے یہ خانہ بدوش اور ہریجن سب اچھوت ہیں۔ ایک ہی مالا کے دانے ہیں۔ ہمیں پرائشچت کرنے کے بغیر اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔" کسی ایک شخص کو بھی تجویزِ بالا کی مخالفت کا حوصلہ نہ تھا۔ لوگوں نے پھر "ٹھاکر جی زندہ باد، دھرم امر ہے، پنڈت جی زندہ باد" کے کئی بار فلک شگاف نعرے لگائے۔ اگیانتا کا زمانہ تھا۔ افسوس کی بات ہے کہ لیڈروں اور سامعین سب کی عقل بھرشٹ ہو چکی تھی۔

لوگ اپنے اپنے گھر پہنچے۔ گھر اور سامان پر حسرت بھری نگاہیں ڈالیں۔ مکھیہ کا فرمان ایشوری حکم سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ہر امیر غریب مرد اور عورت لکڑیاں اٹھائے تیزی سے تالاب کی طرف جا رہا تھا۔ ان میں مکمّل اتحاد تھا، وہ آج جنگِ جہاد میں حصّہ لے رہے تھے۔ لکڑیوں سے تالاب بھر گیا، اور اُنھیں آگ لگا دی گئی۔ جب آگ بھڑک اٹھی تو پنڈت جے چند، ٹھاکر ریپُودمن سنگھ اور ان کے چند ہم عُمر ساتھیوں نے ایک دوسرے کے مضبوطی سے ہاتھ پکڑے اور آگ میں اکٹھی چھلانگ لگا دی گویا دوسروں کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہہ رہی تھی۔ شور و غل اتنا تھا کہ کانوں پڑی آواز

بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ بچے بلک رہے تھے۔ آہ و بکا دل کو چیرنے والی تھی۔ آگ خوب بھڑکی۔ شعلے آسمان کو چھونے لگے۔ مذہب کے یہ شیدائی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تیزی سے آگ میں چھلانگیں لگانے لگے، حتیٰ کہ اس بھیڑ چال میں نئی بیاہتا لڑکیاں بھی کسی سے پیچھے نہ رہیں وہ بھی دھرم کی خاطر اپنے عروسی کپڑوں سمیت جل کر خاکستر ہو گئیں۔ در و دیوار پر حسرت برس رہی تھی۔ قدرت سے بھی یہ نظارہ نہ دیکھا گیا۔ بادل آ گیا اور وہ بھی دو چار آنسو بہا گیا۔ تالاب اور شمشان گھاٹ میں کیا فرق رہ گیا؟ پرماتما کا قہر نازل ہو چکا تھا، قیامت آ چکی تھی۔ قہر لانے والے یہ بوڑھے کھوسٹ پنڈت اور ٹھاکر، مذہب کے نام نہاد ٹھیکیدار خود تو جوانی کی بہاریں دیکھ چکے تھے اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اپنی ذاتی رنجشیں نکالنے کے لیے انھوں نے پانچ سات ہزار کی آبادی کا ایک ہی دن میں اس حد تک بیڑہ غرق کر دیا کہ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ شوک پرکٹ کرنے والا ایک انسان بھی باقی نہ بچا۔ راجھنڈو کا دارالخلافہ شہر اب شہرِ خموشاں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ جس بازار میں کبھی بڑی گہما گہمی تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا اب اس کی سب چہل پہل یکسر ختم ہو چکی تھی، جن مقدس صورتوں سے شہر بس رہا تھا وہ سب خاک میں مل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ہیہات! افسوس، صد افسوس!

رانی منورما کو بھی سب اطلاع لحظہ بہ لحظہ مل رہی تھی۔ وہ تالاب ہی کی طرف نگاہ لگائے بیٹھی تھی۔ کلیجہ کو بڑی مشکل سے تھام کر بیٹھی تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے خاموشی سے بغیر راجہ کو اطلاع دیے تالاب پر پہنچ کر اس نے بھی آگ میں جان دے دی ساتھ ساتھ دھرم کے نام پر وہ ایشور کا گن گا رہی تھی۔ آخر وہ بھی ٹھاکروں کی لڑکی تھی اور راجہ کے ساتھ اس نے زندگی کے کئی سال گذارے تھے، راجھنڈو کا زہرہ آب آب ہو رہا تھا۔ وہ ایک عجیب کرب اور انتشار میں اس حد تک پھنسا ہوا تھا کہ اس کی روح سلگ رہی تھی۔ آٹھ دس سال کے عیش و عشرت اور حکمرانی کا عہد اسے اس طرح معلوم ہو رہا تھا گویا کل

کی بات ہو۔ پچھلی سب باتیں اب ایک خواب اور افسانہ سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھیں۔ شہر کا بھیانک نظارہ لوگوں کے سامان سے بھرے ہوئے اسی طرح کھلے کے کھلے گھر، دکانیں، سودا سلف سے بھرپور، اور انسان نام کو بھی نہیں، راجہ کے لیے بڑا ہی دل خراش تھا۔ ساری رعایا اور وفادار رانی کی آتم ہتیا نے اسے اس قدر بے چین کر دیا کہ وزیر کو کہنے لگا: "ایسی زندگی سے میں تو بالکل بیزار ہو گیا ہوں۔ اب میرا جینا بیکار ہے اس لیے میں بھی اسی نالاب میں جان دینے کی غرض سے جا رہا ہوں، مگر تم ابھی ٹھہرو۔" افتاں و خیزاں تالاب پہنچ گیا:

بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔ امورِ شدنی تو ہو کر ہی رہتے ہیں۔ راجہ نے جاتے ہی چھلانگ لگائی، جل کر بھسم ہو گیا۔

اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے۔ جوں ہی راجہ جھنڈو نے آگ میں چھلانگ لگائی، مہاتما منشی رام جو عرصہ سے ایسی بیماری میں مبتلا تھا جس کا طبیبوں اور حاذق حکیموں کے پاس کوئی علاج نہ تھا، فوراً بے ہوشی سے چونک اٹھا اور از خود اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی تمام امراض جاتی رہیں گویا کسی نے انھیں جڑ سے اکھیڑ دور پھینک دیا ہو۔ وہ نہ صرف بھلا چنگا ہو گیا بلکہ پہلے کی نسبت زیادہ ہشاش بشاش نظر آنے لگا۔ قدرت کے اس معجزہ پر سب انگشت بدنداں ہو رہے تھے۔ مکمل صحت یابی کے تھوڑے ہی دنوں بعد منشی رام نے اپنے والدین سے درخواست کی: "اب آپ میرا فکر نہ کریں۔ میں بالکل تندرست ہو گیا ہوں۔ مگر میری روح بے قرار ہے۔ مجھے آنند صرف پربھو کے نام سے ملتا ہے۔ میری تمام توجہ صرف اسی ایک طرف لگی ہوئی ہے۔ اس کے بغیر میں بے چین رہتا ہوں۔ میری توجہ منتشر کرنے سے پرہیز کیجیے۔ مجھے آج ہی واپس کٹیا پر جانے کی آگیا دیجیے۔"

والدین نے با دلِ نخواستہ اس کی درخواست منظور کر لی۔ منشی رام نے کٹیا پر پہنچ کر پھر اپنی بھگتی شروع کر دی۔ ایک دن جب وہ تالاب پر اشنان کرنے گیا تو وہاں ایک مہاتما سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس مہاتما کے چہرے پر نور برس رہا تھا۔ منشی رام نے

اُسے جھک کر پرنام کیا اور بڑی عزت و تعظیم سے اپنی کُٹیا پر لے آیا۔ کھانے پینے کا جو سامان کُٹیا میں موجود تھا اس سے مہاتما کی خاطر مدارات کی۔ مہاتما جی آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے اور اب ان دونوں کے درمیان یوں بات چیت ہوئی۔ دروغ بر گردنِ راوی۔

منشی رام: "مہاتما جی! آج آپ کدھر سے آ رہے ہیں؟ آپکے چہرے پر تھکاوٹ اور بے چینی کے آثار نمایاں ہیں۔"

مہاتما جی: "پربھو پریمی! آپ کا قیاس بالکل ٹھیک ہے۔ میں ایک بڑے طویل سفر سے آیا ہوں۔ اپنی کُٹیا سے مجھے نکلے ہوئے پورا ایک مہینہ گذر چکا ہے۔ بے چینی کا کارن یہ ہے کہ راستے میں میرا گذر ایک ایسے شہر سے ہوا جو بڑا ہی بھیانک نظارہ پیش کر رہا تھا۔ وحشت برس رہی تھی۔ لوگوں کے مکان کھلے کے کھلے پڑے ہیں، سامان سے بھرے پڑے ہیں۔ اسی طرح دکانیں کھانے پینے کے سامان سے بھرپور پڑی ہیں مگر نام لینے کو بھی کوئی ایک متنفس نظر نہیں آتا۔ ایسی چیز تو آج تک پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ نہ کوئی مرد، نہ عورت اور نہ ہی کوئی بچہ۔ میں نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ ملک کے کئی حصوں میں گھوما ہوں۔ یہ ایک لامثال واقعہ دیکھا ہے شہر میں ایسا ایک آدمی بھی نہ ملا جو صورتِ حالات پر روشنی ڈالے۔ چلتے چلتے راستے میں ایک دیہاتی ملا۔ اُس سے پوچھا تو اس نے ایک بڑی عجیب و غریب کہانی سُنائی۔ کہنے لگا "اس ریاست کا راجہ آٹھ دس سال ہوئے اچانک فوت ہو گیا۔ شہر کی پنچایت نے جلدی جلدی میٹنگ بلا کر فیصلہ کیا کہ کل صبح شہر کے صدر دروازے پر جو اجنبی شخص نظر آئے اُسے پرماتما کا بھیجا ہوا تسلیم کر کے اسے راجہ بنا دیا جائے۔ اگلی صبح جب دروازہ کھولا گیا تو لوگوں کو جو اجنبی شخص سب سے پہلے نظر آیا اُسے راج تلک کر دیا گیا۔ سارے شہر میں خوشیاں منائی گئیں۔ اتفاق سے ایک دن وہی راجہ اپنے امیروں وزیروں کے ساتھ شہر سے باہر سیر پر جا رہا تھا تو سامنے سے خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ آنکلا۔ ان لوگوں نے پہچان لیا کہ یہ راجہ تو ہمارے خاندان کا فرد ہے اور اس کا نام جھنڈو

ہے۔ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے کہ شہر کے دو چار معززین کے کانوں میں بھنک جا پڑی۔
منہ سے نکالی ہوئی بات پرائی ہو جاتی ہے، دیوار ہم گوش دارد (دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں)،
شہر کے مکھیہ پروہت اور ٹھاکروں کے ایک عمر رسیدہ بزرگ کو بھی شدہ شدہ اس راجہ کی
جاتی کے بارے میں پتا چل گیا۔ شہریوں کا ایک جلسہ بلایا گیا جس میں اشتعال انگیز تقریریں
ہوئیں۔ لوگوں کو کہا گیا کہ اس خانہ بدوش راجہ کے ساتھ ہمارے میل جول سے ہمارا دھرم
بھرشٹ ہو گیا ہے جس کا فوری علاج کیا جانا از حد ضروری ہے۔ یہ جاتی اور اچھوت جاتی
ایک ہی چیز ہے۔ دھرم خطرے میں ہے اسے بچایا جانا چاہیے خواہ اپنی جان کی بھی بازی
لگانی پڑے۔ صرف دھرم ہی ستیہ ہے۔ باقی سب کچھ جھوٹ ہے، لوگوں کو دھرم کے نام
پر جان قربان کرنے کے لیے اس قدر اکسایا گیا کہ وہ مقررین کے سجھاؤ پر آگ میں آہوتی
دینے کو تیار ہو گئے تاکہ اس طرح سے وہ موکش پراپت (جیون مرن کے چکر سے نجات حاصل)
کر سکیں چنانچہ شہر کے سبھی باشندگان کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دھرم کے نام کے جیکارے
لگاتے ہوئے اس آگ کی طرف بڑھا۔ اور جل کر بھسم ہو گیا۔ صرف چیلیں اوپر منڈلاتی
ہوئی نظر آتی تھیں۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ رانی اپنی جگہ پر خون کے آنسو بہا رہی تھی کیونکہ
سب رشتہ دار اور تمام رعایا تو آگ میں جل کر خاکستر ہو چکے تھے۔ اس لیے اس نے بھی
اپنے آپ کو اسی آگ میں چھلانگ لگا کر بھسم کر دیا۔ راجہ یہ سب دل خراش نظارے دیکھ کر
گھبرا گیا۔ اس کے دل پر تو انتہائی غم نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ اُسے اب جینا دوبھر ہو رہا
تھا۔ اس لیے اس نے بھی اپنے آپ کو اُسی آگ کے سپرد کر دیا۔ اب وزیر اکیلا رہ گیا تھا۔
سوچنے لگا کہ میں اکیلا چنا بھاڑ کا کیا کر لوں گا۔ وہ بھی مجبوراً اسی آگ میں جل مرا۔ یہی
وجہ ہے کہ یہ شہر شہر خموشاں کا نظارہ پیش کر رہا ہے۔ انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے
کہ ان اونچی جاتی والوں نے اونچی جاتی اور چھوٹی جاتی کا بیکار اور فضول کا سوال پیدا کر کے
پرماتما کی پیدا کی ہوئی مخلوقات میں ایک مستقل طور پر خلیج پیدا کر رکھی ہے۔ راجہ صاحب کے

اوصاف کو پسِ پُشت ڈال دیا اور اس کی بجائے کا سوال کھڑا کر کے اُسے کہیں کا نہ رکھا۔ لوگوں کو دھرم بچاؤ کا نعرہ لگا کر جنت اور جاودانی زندگانی کے سنہرے خواب دکھلا کر اس قدر گمراہ کیا کہ وہ سادہ لوح لوگ اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان مذہب کے ٹھیکیداروں کی عقل پر واقعی پتھر پڑ گئے تھے۔ یہ لیڈر خود تو جاں بحق ہوئے دوسروں کا بھی انھوں نے بیڑہ غرق کر دیا۔"

مہاتما جی یہ کہانی حرف بحرف اُسی طرح منشی رام کو سُنا رہے ہیں جیسے ایک سیدھے سادے کسان نے انھیں سُنائی تھی۔ منشی رام کو سُن کر بہت حیرانگی ہوئی کہ کیا دُنیا میں کبھی ایسا واقعہ بھی ہو سکتا ہے اس لیے دل میں ایک لگن لگ گئی کہ اسی شہر اور اسی موقعہ پر پہنچ کر ساری بات کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ سچ ہے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" (سنی سنائی بات اتنی قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتی جتنی کہ آنکھوں سے دیکھی ہوئی ہوتی ہے) مہاتما جی جب کٹیا سے چلنے لگے تو منشی رام بھی اُن کے ہمراہ ہو لیا۔ اپنی دلی خواہش کا اظہار وہ پہلے کر ہی چکا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات اسی راستے سے گزر رہے ہیں۔ جہاں کسی وقت خانہ بدوشوں کے ایک قبیلہ نے قیام کیا تھا جہاں جھنڈو کا جنم ہوا تھا اور جہاں وہ اپنے بچپن میں ہم جولیوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ راستے میں پھر وہ شہر بھی آیا جہاں جھنڈو کبھی درانتیاں بیچنے گیا تھا، جہاں اس نے ایک پیالے کی چوری کے الزام کی پاداش میں سزا بھی پائی تھی۔ ازاں بعد شہر کے صدر دروازہ پر بھی پہنچا۔ سب یاد آ رہا تھا کہ اسی جگہ رات کو چادر بچھا کر زمین پر بسرام کیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کس طرح راجہ کی پدوی پائی تھی۔ سب نظارے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ مہاتما جی کے بیان کی صداقت میں کوئی شک نہ رہا۔

منشی رام یہ سفر کر کے واپس اپنی کٹیا پر پہنچا۔ حیرانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ حقیقت کا پتا کیسے لگے۔ پرماتما کی لیلا نیاری ہے۔ جلد ہی ایک رات کو اس کی کٹیا پر اچانک روشنی نمودار ہوئی۔ اور اس نے منشی رام پر سوال کیا "اے پریمی بھگت! بتا اب تو کیا چاہتا ہے؟"

منشی رام گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگا "آدرنیہ دیوتا جی! مجھے ایک سوال بہت پریشان کر رہا ہے۔ مجھے یہ سمجھا دو کہ یہ سچ ہے یا وہ سچ ہے۔ یہ جنم جو میں بھگت رہا ہوں یا وہ راجہ بننا اور دُرگھٹنا کا سامنا کرنا۔ میری موت تو کبھی ہوئی نہیں۔ نہ ہی میں کبھی باہر گیا ہوں۔ پھر میرا نیا جنم کیسے ہوا اور میں اتنی مدت راجہ کیسے بنا رہا اور میں خود اپنی آنکھوں سے مہاتما جی کے ہمراہ شروع سے آخر تک کے سارے واقعات کا نظارہ بھی کر آیا ہوں۔ آپ کرپا کر کے اس گتھی کو سلجھائیں۔" وہ سراپا روشنی خود وشنو بھگوان ہی تو تھے۔ منشی رام کو پیار سے کہنے لگے "سیوک! اس میں گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں۔ میں تمھیں تمھاری ایک مانگ کی آج یاد دلانا چاہتا ہوں۔ کبھی تم نے ہم سے اپنا چمتکار دکھلانے کی مانگ کی تھی، اب وہ تمھیں دکھلا دیا ہے تو پوچھتے ہو کہ یہ سچ ہے یا وہ سچ ہے۔ یہ دونوں ہی سچ ہیں۔ تم اپنی ایشور بھگتی کی لگن میں جٹے رہو۔ آخر کامیابی تمھارے قدم چومے گی۔" اتنا کہتے ہی وہ روشنی تو آنکھوں سے اوجھل ہو گئی مگر منشی رام پر اپنا گہرا نقش چھوڑ گئی جو نہ مٹنے والا تھا۔ وہ اب پہلے کی نسبت اور بھی زیادہ بھگتی میں منہمک ہو گیا۔ آٹھوں پہر پرماتما کے دھیان میں مست رہنے لگا۔ ہر دم ایشور کا گن گان ہی چلتا رہتا۔ دنیا کی کسی کٹھنائی سے نہ گھبراتا۔ سچ تو یہ ہے کہ آہستہ آہستہ وہ رُوحانی منزل کے آخر تک جا پہنچا۔ سچ ہے کہ مختلف جیووں کے مختلف کرم ہوا کرتے ہیں اور وہ اپنے ٹھکانے سے رُوحانی منزل کی جانب بڑھتے رہتے ہیں حتیٰ کہ اسے آخر پا لیتے ہیں۔ علم معرفت میں غوطہ لگانا ایک بہت ہی مشکل کام ہے اور اس میں کئی طرح کے دُکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ مگر جنھیں یہ لگن لگ جاتی ہے وہ آسانی سے اس راستے کو کبھی نہیں چھوڑتے۔ مہاتما منشی رام بھی اسی زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وشنو بھگوان نے ان کا بے لاگ اور نشکام جیون دیکھ کر انھیں کئی بار درشن دیے۔ ان کے شریر نے سہج مکتی پائی اور آخر کار وہ جوتی جوت سما گئے۔ ان کی سمادھی پر آج تک میلے لگتے ہیں۔ شردھالو ستیں مانتے ہیں اور وہاں سے گوہر مقصود حاصل کرتے ہیں۔ ان کا نام ایک درخشندہ ستارے کی طرح رہتی دنیا تک چمکتا رہے گا اور لوگوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتا رہے گا۔

قدرت کے نیم اٹل ہیں

پرتاپ پور نام کی ایک جگہ مودی نگر (یو۔پی) کے پاس ہے جہاں کسی وقت ایک سادھو سچدانند رہا کرتا تھا جو جگہ بجگہ پھرتا رہتا تھا اور لوگوں کو ہمیشہ اچھے اچھے اپدیش دیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی اسی کام کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ گھومتے پھرتے ایک دفعہ وہ مودی نگر آنکلا۔ صدر بازار میں مہاشہ رام چند کی مشہور و معروف کپڑے کی دکان تھی۔ سچدانند اس دکان پر پہنچ کر مہاشہ جی کو کہنے لگا "مجھے صرف دو گز کھدر کا گیروہ کپڑا درکار ہے۔ کرپا کر کے مناسب دام لے لیجیے اور کپڑا مجھے جلدی جلدی دے دیجیے کیونکہ میں نے بڑے مندر میں پہنچ کر لیکچر دینا ہے، جس کا پربندھ شہر کے ایک معزز رکن جین صاحب نے کر رکھا ہے۔" اتفاق کی بات ہے کہ مہاشہ جی کی دکان پر اس وقت پانچ سات اور گاہک بھی بیٹھے تھے۔ وہ ان سے باتیں کر رہا تھا۔ یک لخت اس نے جب سامنے کی دیوار پر لگی ہوئی کلاک کی طرف دیکھا تو وہ گیارہ بجانے والی تھی۔ ایک عجیب قسم کی پریشانی اس کے چہرے پر صاف نظر آنے لگی۔ چلا کر سب گاہکوں کو کہنے لگا، بھائیو! چستی سے کام لو۔ جلد از جلد دکان سے باہر نکل آؤ کیونکہ کسی کی پیشین گوئی کے

مطابق میری اس دُکان میں دو چار ہی منٹ میں آگ لگنے والی ہے۔ اُسی شخص کی کہی ہوئی دو باتیں مَیں پہلے بھی آزما چکا ہوں کبھی بے موقع نہیں پایا۔ دیر خطرناک ہو سکتی ہے اس لیے فوراً اپنی جان کی حفاظت کے لیے باہر آجاؤ۔" یہ کہتے کہتے اس نے خود بھی اپنی جگہ سے بازار میں چھلانگ لگا دی۔ قدرت کا کرنا کیا ہوا کہ ان سب کے دُکان سے باہر نکلتے ہی دُکان میں واقعی آگ لگ گئی۔ بجلی کے شارٹ سرکٹ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے اس بات کا کسی کو بھی اور خود مہاشہ جی کو بھی پتا نہ چل سکا۔ یہ ایک بھید ہی رہا۔ آناً فاناً دُکان میں پڑا ہوا کپڑا ریشمی اور سُوتی اور کھادی کا غرضیکہ جو کچھ بھی پڑا تھا جل کر خاکستر ہو گیا۔ مگر کیا مجال کہ مہاشہ جی کے چہرے پر اب کسی قسم کی تشویش، فکر یا گھبراہٹ کے آثار ہوں۔ اردگرد دُکانیں سب محفوظ رہیں۔ راہ چلتے لوگ بھی رُک رُک کر مہاشہ جی سے اظہارِ ہمدردی کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ گاہکوں اور عام لوگوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ پکڑی مگر وہ سادھو سچدانند اپنی جگہ پر بازار میں کھڑا رہا۔ ہرگز اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ حیرانگی میں ڈوبا ہوا تھا کہ آج یہ کیا عجیب واقعہ ہوا ہے جیسا کہ پہلے آج تک نہ دید نہ شنید۔ نئی ہی چیز دیکھنے میں آئی ہے۔ اُسے اس قدر حیرانگی تھی کہ وہ اپنے مندر کے پروگرام کو بھی فراموش کر بیٹھا۔ اب ایک اور صرف ایک خیال اس کے دل میں جاگزیں تھا کہ مہاشہ جی کو کس طرح آگ لگنے کا پہلے ہی پتا لگ گیا تھا اور اگر اسے پہلے سے اس آگ لگنے کی جانکاری تھی تو اس نے کیوں کوئی حفاظتی تدابیر اختیار نہ کیں۔ بہرحال یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ اسے جس کسی نے بھی پہلے آگاہ کر دیا تھا وہ لازمی طور پر پرماتما کو پہنچا ہوا ہوگا۔ ایسی پیشین گوئی سادھارن انسان تھوڑا ہی کر سکتا ہے۔ چنانچہ مناسب ماحول دیکھ کر وہ مہاشہ جی کے پاس جا کر یوں گویا ہوا۔ "مہاشہ جی! آپ کے اس قدر نقصان سے مجھے بہت رنج و ملال ہوا ہے قدرت کے کام انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ کسی کو بھی پتا نہیں چل سکا کہ کون سا کام کس وقت ہونا ہے مگر کرپا کر کے یہ تو بتا دیجیے کہ آپ کو کس نے پہلے ہی یہ بتا دیا تھا کہ فلاں دن اور فلاں وقت تمھاری دُکان میں آگ لگ جائے گی۔ مزید آپ نے کہا تھا کہ جس شخص نے آپ کو آگ لگنے کی تنبیہہ

کر رکھی ہے وہ پہلے بھی آپ کا آزمودہ ہے جب اس شخص کی تباہی ہوئی یا میں پہلے بھی سچ نکلیں اور تمھارا اس شخص پر اتنا بھروسہ اور یقین تھا تو تم نے آج کیوں اپنے سامان کو دکان سے باہر نکال لیا؟ اگر آپ بروقت قدم اٹھاتے تو اس قدر نقصان نہ اٹھانا پڑتا، اور خواہ مخواہ اتنا زیر بار نہ ہونا پڑتا اور میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے چہرے پر کوئی تشویش یا گھبراہٹ نہیں ہے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں تمھاری جگہ پر اگر کوئی اور ہوتا تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی ہوتی اور چہرہ غم سے پژمردہ ہوتا مگر تم ایسے کھڑے ہو گویا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ حالات کی مسموم ہوائیں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔ کم از کم میں تو اس پیچیدہ گورکھ دھندے کو نہیں سمجھ سکا۔ کچھ روشنی ڈالیے۔ سادھو کی اس خواہش کو پورا کیجیے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ یہ جانکاری حاصل کیے بغیر میں اس جگہ سے ہرگز نہیں ٹلوں گا۔"

مہاشہ جی نے جب سادھو کا یہ رویہ دیکھا تو کچھ تامل کے بعد یوں لب کشائی کی۔

"مہاتما جی! آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔ میرے گورو کا نام بھگت گورمکھ داس ہے۔ وہ ہری پورہ گاؤں میں رہتے ہیں جو یہاں سے بجانب مشرق پانچ چھ کوس کے فاصلے پر ہے وہ ایک سادھارن کسان ہیں مگر انھیں ہر وقت پرماتما کے نام کی خماری چڑھی رہتی ہے۔ ہر وقت پربھو کے بھجنوں کا گن گان کرتے رہتے ہیں، کھانے کے وقت، کام کرنے کے دوران اٹھتے بیٹھتے سُر سے بھگوان کی مہما گاتے رہتے ہیں، وہ ایسے انسان ہیں جن کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے: نہ دشمن ہے کوئی اپنا نہ ساجن ہی ہمارے ہیں۔ گیتا وید اور منظوم رامائن سب انھیں حفظ بر زبان ہیں۔ آپ ان کے اوصاف کا اندازہ ان کی دستار رفتار اور گفتار سے لگا سکتے ہیں۔ ایسے گن وان تو زمین پر پھرتے ہوئے بہتا باں ہیں کبھی ترنگ میں آ کر وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ ہمیشہ ٹھیک نکلتا ہے۔ دکان میں آگ لگنے کی بھوشش بانی بھی ان ہی کی ہے۔ ساتھ انھوں نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ دکان کے نقصان کی وجہ سے ہرگز افسوس نہیں کرنا۔ دل کو تسلی دینا کہ یہ سب مال اُسی پرماتما کا دیا ہوا تھا۔ اس نے ہی واپس لے لیا۔ میرے پاس تو یہ صرف چند

روزہ امانت تھی۔ گورو کی تعلیم کے مطابق میں نے عمل کیا ہے۔ افسوس کس بات کا؟ امید ہے آپ میرے نظریے کو سمجھ گئے ہوں گے۔"

سادھو کی بھلا ان باتوں سے کیسے تسلّی ہوسکتی تھی۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اس کے دل میں ایک تڑپ اُٹھی کہ جلد از جلد ہری پورہ گاؤں پہنچ کر بھگت گورمکھ داس کے خود درشن کروں جس کی اتنی تعریف مہاشہ جی سے سنی ہے۔ اسے اپنا کھانا پینا حرام ہوگیا تھا۔ دھوپ چھاؤں کی پروا نہ کرتے ہوئے تیزی سے چلتے ہوئے آخر کار وہ اگلے دن ہری پورہ پہنچ گیا۔ اپنے دل میں جو شک شبہ تھا اس کو مٹانا بھی تو ضروری تھا۔ ایک سچی لگن لگ رہی تھی۔ لوگوں سے پوچھ کر سادھو گورمکھ داس کے گھر پہنچا اور دستک دی۔ لوگوں میں وہ عام طور پر بھگت جی کے نام سے مشہور تھا۔ بچے بچے کو اس کسان کے گھر کا پتا معلوم تھا۔ اندر سے بھگت جی کی بیوی نے جب سادھو کو دیکھا تو اس نے کواڑ کھول کر سادھو کو پرنام کیا۔ چارپائی پر بٹھایا اور ان کی خاطر تواضع کی اور پھر آنے کا مقصد پوچھا۔ سادھو کہنے لگا "اے دیوی! کل میں مودی نگر صدر بازار میں مہاشہ جی کی دکان پر کچھ کپڑا خریدنے گیا تھا۔ کئی اور گاہک بھی وہاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ میں نے کل جو گھٹنا وہاں دیکھی وہ اب بھی میرے دل کو تڑپا رہی ہے۔ میرے دل کا سکون ختم ہوچکا ہے۔ میں وہاں سے بھاگا بھاگا ادھر آیا ہوں۔ کیونکہ میرے دل کو شانتی تبھی نصیب ہوگی جب میں بھگت جی سے مل لوں گا۔ آپ کرپا کرکے میری ان سے ملاقات کرادیجیے۔" بھگت جی کی بیوی کہنے لگی "مہاراج! بھگت جی تو صبح سے کھیتوں میں گئے ہوئے ہیں۔ بارہ بجے دوپہر کے قریب واپس گھر لوٹیں گے۔ تو آپ ان سے جلدی جلدی مل لینا۔ مجھے وہ جاتی دفعہ کہہ گئے تھے کہ آج میری عمر ختم ہورہی ہے مجھے ساتھ ہی انھوں نے یہ تلقین کی تھی کہ اُن کی موت پر سوگ بالکل نہیں منانا۔ قدرت کی طرف سے اتنا ہی سنجوگ سمجھ کر پرماتما کا شکر کرنا۔ بھگت جی کبھی کبھی ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جو ناقابلِ اعتبار ہوتی ہیں۔ آٹھ دس سال ہماری ازدواجی زندگی کے اسی طرح ہی بسر ہوگئے ہیں۔ مہاتما جی! آپ نے مودی نگر کی گھٹنا کی تفصیل تو سنائی ہی نہیں۔" سادھو بولا "اے دیوی! گیارہ بجے سے ایک

دو منٹ پہلے بترازنے چیخ کر سب گاہکوں کو فوراً دُکان سے باہر نکل جانے کے لیے متنبہ کیا یہ کہہ کر کہ اس کی دُکان میں ابھی ابھی آگ لگ جائے گی اور وہ خُود بھی چھلانگ لگا کر اپنی جگہ سے بازار میں آگیا۔ ہم سب کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے باہر نکلتے ہی دُکان میں آگ لگ گئی اور سب کپڑا جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ میں نے تو یہ سمجھ رکھا تھا کہ مہاشہ ایک مورکھ انسان ہے، جسے پہلے ہی آگ لگنے کی کسی طرح وارننگ مل چکی تھی تو اس نے دُکان سے سامان بروقت کیوں نہ نکال لیا۔ دوسری بات جو حیران کُن ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہرگز گھبرایا نہیں۔ نہ ہی اسے کوئی افسوس ہوا لیکن بترازنے جب ساری تشریح کی تو مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ مورکھ نہیں ہے۔ اسے یہ تنبیہ بھی بھگت جی کی طرف سے ملی تھی جنھیں وہ اپنا گورو مانتا ہے، اب یہ بات قدرتی تھی کہ میں بھگت جی کے بھی تو درشن کروں، اشتیاقِ ملاقات ادھر کھینچ لایا۔" بھگت جی کی بیوی بولی۔

"مہاراج! آپ نے مودی نگر کا یہ جو قصہ سنایا ہے، واقعی بڑا حیران کُن ہے۔ بھگت جی کبھی کبھی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ آپ ان کے آنے پر اپنی تسلی کے لیے جو بات چیت کرنی ہو جلدی جلدی کر لینا۔ میں ان کے نہانے کے لیے پانی کنوئیں سے لے آؤں اور پھر آگر روٹی وغیرہ بھی پکانی ہے بچے بار بار مانگ رہے ہیں۔ آپ ان کے آنے تک سُستا لیجیے۔"

ٹھیک بارہ بجے دوپہر بھگت جی "رام رام" کہتے ہوئے اپنے گھر لوٹے۔ بیل اپنی جگہ پر باندھے۔ ہل وغیرہ اپنے ٹھکانے پر رکھے اور اپنی بیوی کو آواز دی کہ "نہانے کے لیے پتھر پر پانی رکھ دیا ہے یا نہیں؟" ایسا ہی ان کا ہر روز کا معمول تھا۔ بیوی نے سادھو کو بتلا دیا کہ "بھگت جی آگئے ہیں۔ آپ انھیں مل لیں۔" اور اپنے پتی کو جواب دیا: "نہانے کے لیے پانی پتھر پر رکھ دیا ہے۔ آپ غسل کر لیں۔ میں اتنی دیر میں کھانا تیار کرتی ہوں۔" بھگت جی کہنے لگے۔ "اے بھاگوان! تو خوشی سے کھانا تیار کر۔ جس کی قسمت میں ہو گا وہ کھالے گا۔ ہاں تو میری صبح کی کہی ہوئی بات کو فراموش نہ کرنا۔ اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول کرنا، اور اسی میں راضی برضا رہنا۔ انسانی زندگی فانی ہے، ابدی تو ہے نہیں۔"

سادھو نے بھگت جی اور اس کی بیوی کے درمیان ہوئی ساری بات سُن لی۔ وہ بھگت جی کے نزدیک چلا گیا اور نمستے کی۔ بھگت جی نے بھی اپنی طرف سے سادھو کو پوری عزت دی۔ کہنے لگے "مہاراج ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے ہمارے غریب خانے پر پہنچ کر ہمیں درشن دیئے۔ یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے۔ آپ نے کیسے تکلیف کی ؟ آپ کے چہرے سے قدرے تھکاوٹ اور بے چینی نظر آرہی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" سادھو نے مودی نگر کا سارا واقعہ بھگت جی کو من و عن اسی طرح دُہرایا جیسا کہ چند گھنٹے پہلے بھگت جی کی بیوی کو سنایا تھا۔ اور وہی سوال ان کے سامنے رکھے۔ بھگت جی پوچھنے لگے "اچھا تو آپ مودی نگر کے بزاز مہاشہ رام چند کی دُکان میں آگ لگنے کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ مجھے پتا تھا اور میں نے اسے بروقت بتلا دیا تھا۔ مگر شُدنی امور تو ہو کر ہی رہتے ہیں۔ اس میں کسی کا بس نہیں چلتا حتیٰ کہ جس شخص کی موت کسی خاص مقام پر ہونی لکھی ہوتی ہے وہ شخص خود بخُود اسی جگہ جا پہنچتا ہے۔ حالات ہی ایسے بن جاتے ہیں: خدا کی باتیں خُدا ہی جانے۔ مہاشہ جی لاکھ کوشش کرتا تو بھی وہ اس نقصان سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اپنا وہ پرانا بھگت ہے۔ اچھا میں اب نہانے جا رہا ہوں اور کوئی سوال ہے تو وہ بھی ابھی بتا دو۔ مجھے تو اپنی زندگی کا بھی خاتمہ نظر آرہا ہے مگر مجھے اپنے آپ کو بچانے کا بھی کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا۔ مہلت تھوڑی ہی رہ گئی ہے۔"

سادھو یہ سُن کر حیران پریشان رہ گیا۔ اسے یہ سُن کر انتہائی افسوس ہو رہا تھا، اور اپنے کانوں پر بھی اعتبار نہ آرہا تھا، مگر حوصلہ کر کے اُس نے بھگت جی پر ایک اور سوال کیا "بھگت جی! کرپا کر کے مجھے یہ تو بتا دیجیے کہ آپ کو کس طرح پہلے ہی علم ہو گیا ہے کہ آپ کی زندگی اب قریب الاختتام ہے ؟" بھگت جی کہنے لگے "یہ سب کچھ میرے گورو شمبھو جی مہاراج کی پیشین گوئی ہے۔ وہ یہاں سے تقریباً دس کوس کے فاصلے پر مراد پُور گاؤں میں رہتے ہیں، وہاں انھوں نے سنت منڈلی بنائی ہوئی ہے ہر وقت سنت سنگ چلتا رہتا ہے۔ بزرگ آدمی ہیں۔ ہر ویروار اور شکروار کو وہ سنگت

کو اپدیش دیتے ہیں۔ اِرد گِرد کے دیہات سے سینکڑوں مرد اور عورتیں اُن کے اُپدیش سُننے آتے ہیں۔ مَیں بھی پچھلے ویروار کو وہاں گیا تھا اور انھوں نے مجھے بھی میری زندگی کے بقایا تھوڑے دِنوں کے متعلق بتلا دیا تھا۔ اور مَیں نے ساری بات اپنی بیوی کو بتلا رکھی ہے۔"

سادھو پر یہ باتیں سُن کر اتنا اثر ہوا کہ گویا بجلی گر پڑی ہو مگر حوصلے سے اپنے آپ کو تھامتے ہوئے کسی ڈھابہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ آنے والے واقعہ کا انتظار کیا جانا ضروری تھا۔ بھگت جی نہانے کے لیے پتھر پر بیٹھ گئے۔ ابھی پاؤں دھونے ہی شروع کیے تھے کہ پتھر کے نیچے سے ایک کالا ناگ نکلا اور اس نے بھگت جی کو ڈس لیا۔ بھگت جی چیختے چلّاتے پتھر سے اُٹھ کر بھاگے۔ جسم کا رنگ نیلا ہو گیا اور منہ سے جھاگ نکلنی شروع ہو گئی۔ انھوں نے جب بیوی کو سانپ ڈسنے کی بات بتلائی تو وہ دوڑی دوڑی ہمسایوں کو بلا لائی۔ انھوں نے فوراً وید، حکیم اکٹھے کر لیے۔ علاج شروع ہو گیا مگر قضا کے آگے کسی کی پیش نہ چلی اور بھگت جی پرلوک سدھار گئے اور ہمسایگان میت اُٹھا کر شمشان گھاٹ لے گئے:

تابوت تو تھا کندھوں پر رُوح ملکِ عدم میں
کوسوں ہی دُور نکل گیا پیدل سوار سے

بھگت جی کی بیوی اس طرح خاموش تھی جیسے کہ گھر میں کچھ ہوا ہی نہیں حسبِ معمول کھانا پکانے اور گھر کے دیگر کام کاج میں لگ گئی۔ سادھو نے بھی یہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بڑا سہم گیا۔ اس نے بھگت جی کی بیوی کو اظہارِ افسوس کیا تو وہ کہنے لگی "مہاراج! افسوس کس بات کا؟ میرے پاس ایک امانت تھی، وہ میں نے مقررہ وقت پر اُس پیدا کرنے والے کو واپس لوٹا دی۔ اب یہ دو بچے ہیں، بڑے ہو جائیں گے تو میرا سہارا بن جائیں گے۔ داتا نے روزی تو سب کو دینی ہی ہے۔ مجھے فکر کیوں ہو؟

سادھو نے جب یہ باتیں سنیں تو وہ ہکّا بکّا رہ گیا کہ بھگوان کے اوپر ان لوگوں کا

کتنا پکا اعتقاد ہے۔ یہ تو میرے سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ مگر اب اس کے دل میں ایک زبردست
خواہش شمبھو جی مہاراج کے نیاز حاصل کرنے کی اُٹھی کہ وہ تو ایک بہت ہی اونچی ترقی کے
مالک ہوں گے کیوں کہ وہ بھگت جی کو خود آزما چکا تھا اور وہ بھگت جی کے بھی گورو ہیں۔
اس لیے اب وہ سادھو مراد پور کی طرف چل پڑا۔ حیران تھا کہ یک نہ شد دو شد۔ دیکھے بعد
دیگرے دو واقعات دیکھ لیے۔ موری نگر کا واقعہ اور پھر بھگت جی کی موت کا سانحہ
گرتا پڑتا آخر کار وہ سادھو شمبھو جی مہاراج کی ست سنگ والی جگہ گیتا مندر پہنچ گیا۔
جو کچھ اس بارے میں سن رکھا تھا اُس سے کہیں بڑھ کر مہاراج کی شخصیت اور ان کا ست سنگ
پایا۔ لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی اور پھر مکمل خاموشی
مہاراج آئے۔ ان پر پنڈال میں چاروں طرف سے پھولوں کی بارش ہو رہی تھی اور سوامی جی
مہاراج زندہ باد! ہمارا دھرم امر ہے۔ کے فلک شگاف نعرے لگائے جا رہے تھے۔ مہاراج
نے وقتِ مقررہ پر اپنا بھاشن دیا۔ لوگوں نے بڑی خاموشی سے اُن کا بھاشن سنا اور پھر آہستہ
آہستہ انھوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ سادھو بھی اسے سن کر بڑا متاثر ہوا۔ اسے صرف یہی
خیال تھا کہ موقعہ پا کر مہاراج جی سے کچھ باتیں پوچھ سکوں۔ چنانچہ جب سادھو نے ذرا خلوت دیکھی
وہ اُن کے قریب چلا گیا۔ بڑی عاجزی سے انھیں پرنام کیا۔ وہ تو اپنے سوالات کے جوابات
پانے کے لیے سرگرداں تھا اور اسی جستجو میں وہ بھاگتا بھاگتا اس طرح یہاں آیا تھا جیسے ایک
تشنہ پانی کی طرف بھاگتا ہے۔ مہاراج نے جب سادھو کی طرف دیکھا تو وہ فوراً بول اُٹھا۔
مہاراج جی! میں بہت دور دراز سے آپ کی تعریف سن کر آیا ہوں۔ میرے دل کے شبہات
دور کرنے کی کرپا کیجیے۔ یہ کہتے کہتے سادھو نے پہلے موری نگر کے بزاز کی دکان میں آگ لگنے
کا واقعہ۔ بزاز کا جواب اور بعد میں ہری پورہ گاؤں میں بھگت گورمکھ داس سے ملاقات
اور ان سے ہوئی بات چیت اور ان کی موت کا آنکھوں دیکھا حال اور سب سے بڑھ کر بھگت
جی کی بیوی کے خیالات انھیں سنائے۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ مہاراج نے سب کچھ سننے کے

بعد صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔ "گورمکھ! تو اتنا سمجھ کہ قدرت کے نیم اٹل ہیں۔ ہر کام کا وقت
مقرر ہے اور وہ کام اوشش اپنے مقررہ وقت پر ہو گا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہیں۔ لاکھوں دانا،
کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے قدرت کے اس بھید کو دریافت کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے
رہے۔ حکیم اور مہندس اپنی اپنی جگہ پر عقل کے گھوڑے دوڑاتے رہے مگر سب ناکام رہے۔ قدرت خود ہی
ہونے والے واقعات کے لیے اسباب پیدا کر دیتی ہے جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔
یہاں انسان کی دانشوری نہیں چل سکتی۔ البتہ وہ انسان جن کی چشمِ باطن وا ہوتی ہے۔ ان آنے
والے واقعات کا کچھ گیان رکھتے ہیں۔ بھگت گورمکھ داس گو اب اس جہاں میں نہیں رہا، مگر
وہ اسی زمرہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی اپنی ہونے والی موت کا علم اسے پہلے ہی ہو چکا تھا۔
ایسے شخص دُنیا میں معدودے چند ہوتے ہیں؛ مارے راکھے ایکو آپ۔ مانکھ کے کچھ نہیں ہاتھ۔
(کسی کو زندہ رکھنا اور مارنا پرماتما نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ انسان یہاں آکر بے بس و
مجبور ہو جاتا ہے) مقدر میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ خواہ مخواہ مل جاتا ہے۔ انسان کی موت کا وقت
بھی اس کے مقدر میں لکھا ہوا ہوتا ہے اور جب کاتبِ تقدیر لکھتا ہے اس وقت بچہ ابھی
ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ہم راضی برضا رہیں۔" سادھو اس موثر تقریر سے
بہت پربھاوت ہوا، مگر ایک دفعہ پھر بات چلائی۔ "مہاراج! اگر ان لوگوں کو ہونے والے واقعات کا پہلے ہی سے علم ہو گیا
تھا تو بزاز اور بھگت جی کو چاہیے تھا کہ ان کو روکنے کا کچھ تو سدِباب کرتے، مگر میں نے جو مشاہدہ کیا ہے اس سے
میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان لوگوں نے بے حد لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ مقدر میں لکھا ہوا بے شک
انسان کو ملتا ہے مگر ہمیں فہم و ذکا بھی تو اسی نے دی ہیں۔ تدبیر سے کئی بگڑے کام سنور سکتے ہیں۔"
مہاراج نے جواب دیا۔ "اے پریمی! تو نے آج بڑے عجیب و غریب سوال کیے ہیں۔ میں تمہیں
پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ تجربہ، دلیل، قیاس اور تحقیق سب اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ
قدرت کے کاموں میں کسی کا دخل نہیں۔ وہ بیچارہ بزاز مہاشہ جی اور وہ بھگت گورمکھ داس کس
طرح اپنے آپ کو بچا لیتے۔ جب کہ بڑے بڑے رشی منی اور تپسوی بھی اپنے لیے کچھ نہ کر سکے۔

ہر ایک کام کا واقع ہونا نظامِ قدرت سے مطابقت کھائے گا اور وہ معین ہے، تجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو؟ ان آخری الفاظ کو سن کر سادھو کے کان کھڑے ہو گئے اور چوکنا ہو کر اپنی رخصتی گفتگو میں اپنے بارے میں بھی مہاراج سے پوچھ بیٹھا۔ مہاراج جی اپنے خیال میں یکسو ہونے کے بعد اسے کہنے لگے "اے پرائی! مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تیری زندگی کے بھی اب تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق آج سے ٹھیک دسویں دن اسی شہر کے چوگان میں اس سامنے والے پیپل کے ساتھ باندھ کر تمھیں پھانسی کی سزا دی جائے گی، دوسروں کی باتیں تم چھوڑو۔ تمھارے پاس تو اب وقت بھی ہے۔ تم تقدیر کے مقابلے پر اپنی تجویز اور تدبیر سے اپنی جان بچا سکتے ہو تو ضرور بچاؤ۔ تم نے سنا نہیں ہے: تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ (انسان اپنی تدبیر تو کرتا ہے مگر تقدیر اپنی جگہ پر ہے۔ اور اس کی تقدیر کے سامنے کوئی پیش نہیں چلتی) سادھو یہ الفاظ سن کر حیران پریشان رہ گیا منہ سے ایک لفظ بھی نکلنا مشکل ہو گیا گویا سانپ سونگھ گیا ہو۔ دبی زبان سے ایک شکست خوردہ انسان کی طرح سر جھکا کر اس نے شمبھو جی مہاراج کو پرنام کیا اور اپنی جان بچانے کی غرض کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پنڈال سے فوراً باہر نکل گیا۔ اب اس کے دماغ میں صرف ایک ہی خیال سمایا ہوا تھا کہ میں اس جگہ سے جتنی دور بھی بھاگ سکوں بھاگ جاؤں۔ بیچارے کے چہرہ پر ازحد افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اب شام ہو چکی تھی۔ آفتاب ایک مجروح کی طرح زرد رو گوشۂ مغرب میں چھپنے والا تھا مگر سادھو کو چین کہاں۔ وہ تو وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ تیزی تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ دن کی چلچلاتی دھوپ بھی اسے چلنے سے روک نہ سکتی تھی۔ اس طرح دو دن اور دو راتیں وہ چلتا ہی گیا۔ آخر تھک کر جب چور ہو گیا تو سستانے کے لیے ایک درخت کے سایہ میں لیٹ گیا مگر نیند نہ آنی تھی اور نہ آئی۔ ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں سے جو شخص اس قدر دوچار ہو اسے بھلا نیند آئے بھی تو کیسے؟ ان تفکرات نے اسے ایک پلک

بھی نہ جھپکنے دی۔ رات بھی اس نے تارے گِن گِن کر کاٹی۔ وہ ایک ایسی مشکل میں پھنس چکا تھا جس سے نکلنے کے لیے اُسے کوئی راہِ فرار نظر نہ آ رہی تھی۔ اسی ادھیڑ بُن میں لگا ہُوا تھا۔ کبھی سوچتا کہ میں نے مودی نگر کے بزاز کی دُکان میں آگ لگنے اور ہری پورہ کے بھگت جی کی مَوت کے معاملات کی پیروی کر کے کیا لینا تھا؟ اب اپنی متوقع موت کی جانکاری دس دن پہلے حاصل کر کے خواہ مخواہ اپنی جان کو عذاب میں ڈال لیا ہے۔ اس طرح سے اُس کی زندگی تاریکی کے عمیق سمندر میں ڈوبی جا رہی تھی۔ ایسی زندگی تو موت سے بھی بدتر ہے پھر خیال آجاتا کہ میں تو ایک ایسا انسان ہوں جو گلی کے تنکوں سے بھی ڈرتا ہے میں نے کون سا ایسا گناہ کیا ہے کہ مجھے پھانسی دے دیں گے۔ کتنا بھی دل کو سمجھاتا مگر مہاراج کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے کہ "قدرت کے نیم اٹل ہیں، اور تمھاری قسمت میں آج سے ٹھیک دسویں دن پھانسی لکھی ہوئی ہے" اس طرح وہ آٹھ دن لگاتار دن رات سفر کر کے بہت ہی دُور نکل گیا تب کہیں اس کے دَم میں دم آیا۔ اپنے آپ کو قدرے محفوظ سمجھنے لگا مگر یہ اس کی محض خوش فہمی تھی۔ اُسے کیا پتا کہ عنقریب پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آنے والا ہے۔ رات کو بھی نیند نہ آتی، گویا کانٹوں کی سیج پر لیٹا ہوا ہو۔

ریاست رام پور کے راجہ کی کمسِن لڑکی شاہی باغ میں ایک دن چہل قدمی کر رہی تھی۔ اتفاق سے اُس روز اس کی خواص ہمراہ نہ تھیں۔ چند غنڈے اسے اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ راجہ اور رانی بڑے بے چین ہو گئے۔ راجہ نے اپنے پُرانے تجربہ کار پولیس افسر اس کام پر مامور کر دیے کہ جلد از جلد راجکماری کی تلاش کرو۔ اغوا کنندگان کو بھی خبر مل گئی۔ انھوں نے بھی بہتر سمجھا کہ لڑکی کو کہیں چھوڑ دیا جائے چنانچہ وہ اُسے اسی درخت کے پاس لے آئے جہاں وہ سادھو سو رہا تھا اور وہ خود کہیں روپوش ہو گئے۔ اتفاق کی بات ہے پولیس افسر بھی گھومتے پھرتے اسی نیم کے درخت کے پاس آئے جہاں وہ

سادھو سو رہا تھا اور راجکماری سہمی ہوئی پاس بیٹھی تھی۔ راجکماری پر اس قدر دہشت چھائی ہوئی تھی کہ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نکلنا مشکل ہو رہا تھا۔ انھوں نے سادھو کو اور راجکماری کو اپنے تیز رفتار گھوڑوں پر بٹھایا اور دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرتے ہوئے انھیں دربار میں لے جا کر پیش کر دیا اور لڑکی کے ملنے کی کہانی اپنے ہی ڈھنگ سے راجہ صاحب کو سُنائی۔ راجکماری کو تو محل میں بھیج دیا گیا۔ اور راجہ سادھو پر برس پڑا۔ اس بیچارے نے اپنی صفائی پیش کرنے کی ہر چند کوشش کی مگر سب بے سود۔ اس نے سادھو کی بات سننے سے ہی صاف انکار کر دیا۔ ہیبت شاہی سے امیر درباری بھی کانپ رہے تھے۔ انھیں بھی دخل اندازی کی جرأت نہ ہوئی۔ راجہ صاحب نے حکم دیا کہ "اگلے دن صبح کو اس سادھو کو اس درخت کے نیچے پھانسی پر لٹکا دیا جاوے جہاں پہلے ایسی سزا دی جاتی ہے"۔ سادھو نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ : نے اشک میں سرایت نے آہ میں اثر ہے۔ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح ایک کونے میں کھڑا تھا۔ مقررہ وقت پر سرکاری اہل کار سادھو کو اس پیپل کے درخت کے نیچے لے گئے۔ دبی سسکیاں امنڈ پڑیں اور اب تو آنسو بھی جواب دے چکے تھے۔ یہ جگہ اور یہ دن وہی تھے جو مہاراج نے سادھو کو تبلائے تھے۔ سادھو سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ پچھلے جنم میں کوئی ایسا گناہِ کبیرہ کیا ہوگا جس کی سزا آج بھگت رہا ہوں۔ ایسا بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ اصل گنہگار تو بچ جاتا ہے اور بے گناہ سزا پاتا ہے۔

اَن ہونی کے ہون کو چاہت ہیں سب کوئے   اَن ہونی ہونی نہیں ہونی ہو سو ہو

(ہر کوئی چاہتا ہے کہ بُرا وقت نہ آئے مگر یہ ممکن نہیں۔ ہونی نے تو ہو کر ہی رہنا ہے۔)

شمبھو جی مہاراج کی بھوشش بانی اب بھی حرف بحرف درست نکلی۔

ست سنگ کی مہما

تریتایگ کی ایک پُرانی روایت کے مطابق ایک ہی وقت میں دو مشہور گورو ہوئے ہیں۔ وِششٹ جی اور مُنی وِشوامتر جی۔ وِششٹ جی کے ست سنگ کی تعریف دُنیا کے کونے کونے میں ہوتی تھی جب کہ مُنی جی گھور تپسیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ گویا دونوں برگزیدہ ہستیاں اپنے اپنے کام میں یکتا تھیں۔

ایک دفعہ تیرتھ یاترا کے دوران گورو وِششٹ جی کا گذر مُنی وشوامتر جی کے آشرم کے نزدیک ہوا۔ اشتیاقِ ملاقات ہُوا تو آپ مُنی جی کے آشرم پہنچ گئے۔ مُنی جی نے بڑی عزت کی جتنے روز بھی وِششٹ جی ان کے ہاں ٹھہرے مُنی جی اچھے سے اچھے پھل، میوے اور کھانے جو وہاں میسّر ہو سکتے تھے، وِششٹ جی کے پیش کرتے رہے اور ان کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ چند دن اس طرح سے انتہائی پیار سے گیان دھیان کی باتوں میں کٹ گئے۔ آخر ایک دن گورو وِششٹ جی نے مُنی جی سے اپنے آشرم جانے کے لیے اجازت مانگی۔ مُنی جی نے اُن کا آشرم میں آنے کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی انھیں ایک ہزار سال کی تپسیا کا پھل بھینٹ کیا۔ وِششٹ جی نے بخوشی تمام یہ پھل منظور کر لیا، اور روانگی سے پہلے مُنی جی کو اپنے آشرم میں کبھی آنے کا نمنترن بھی دیا۔

وقت گزرتا گیا۔ مُنی جی ایک دفعہ مہاراجہ دشرتھ کے دربار گئے، وِششٹ جی سے ملاقات ہوئی تو وہ اُنھیں اپنے آشرم لے گئے۔ انکار کی گنجائش تو تھی نہیں۔ وِششٹ جی اپنے ست سنگ کے کام میں

ہمہ تن مصروف رہتے۔ منی جی بھی ست سنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اور بہت خوش وخرم رہے۔ وقت مسرت سے کٹ گیا۔ آخر منی جی کی روانگی کا وقت آ گیا۔ وششٹ جی نے حسب رواج منی جی کو گنگا جل بھینٹ کیا اور کہا۔ "منی جی! میں آپ کو ایک کشن (وقت جو آنکھ جھپکنے میں درکار ہوتا ہے) ست سنگ کا پھل دان کرتا ہوں۔ کرپا کر کے اسے قبول کیجیے۔ آپ میرے اس چھوٹے اور حقیر دان کو ہی بڑا سمجھ لینا۔" یہ الفاظ سن کر منی جی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگے۔ بہت غصہ آیا مگر پی گئے۔ خوب جانتے تھے کہ غصہ نرک کا دروازہ ہے اور دل و دماغ کے سکون کا بڑا دشمن ہے اور اس موقعہ پر غصہ پر قابو پانا ہی مردانگی کا کام ہے۔ مصلحت خاموش رہنے میں ہی تھی۔ بعض دفعہ خاموشی سے وہ کام سر انجام ہو جاتے ہیں۔ جو زبان کھولنے سے بھی نہیں ہو سکتے۔ غصہ کے اظہار سے ہزاروں سال کی تپسیا خاک میں مل سکتی تھی۔ غصہ میں طبعی شرافت کا نام و نشان تک باقی نہیں رہ جاتا۔ چہرے سے انسان کے اندرونی خیالات کا پتہ چل ہی جاتا ہے۔ وششٹ جی بھی کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھے۔ بھانپ گئے کہ منی جی کچھ ناخوش ہیں۔ ویسے بھی اپنے مہمان کو ہر طرح سے خوش رکھنا میزبان کا فرض اولین ہے، اس لیے ازراہ معذرت انھیں یوں خطاب کیا۔ "منی جی! آپ قدرے ناخوش معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی سیوا میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔" منی جی نے جواب دیا۔ "پیارے متر! سیوا تو آپ نے میری امید سے کہیں بڑھ کر کی ہے۔ اس کے لیے میں شکر گذار ہوں، مگر آپ نے ست سنگ کا دان جو بخشا ہے وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا۔ میں صاف گو انسان ہوں۔ اپنے دل میں جو کچھ ہے وہی باہر سے ہوں۔ یہ دان قبول کرنا میری بے عزتی ہے۔ آپ نے میرے دان اور اپنے دان کو ہم پلہ سمجھ لیا ہے۔ کہاں ایک ہزار برس کی تپسیا کا پھل اور کہاں ایک کشن ست سنگ کا پھل۔ آپ کی پیش کش کو میں اپنی بے حرمتی سمجھ رہا ہوں۔ اس کی بجائے اگر آپ مجھے کچھ نہ دیتے تو وہ بدرجہا بہتر ہوتا۔" وششٹ جی کہنے لگے "منی جی! آپ ایک بہت بڑے مہاتما ہیں اور آج تو آپ میرے معزز مہمان بھی ہیں۔ اس لیے میں کسی قیمت پر آپ کو ناراضگی کا موقعہ نہیں دینا چاہتا۔ یہ ایک اصلیت ہے کہ میں نے جو بھی تھوڑا بہت دان دیا ہے وہ بھی اپنی

حیثیت سے بڑھ کر دیا ہے۔ آپ حساب کے چکر میں پڑ کر خواہ مخواہ پریشان ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو میرا دان آپکے دیے ہوئے دان سے کمتر نظر آرہا ہے تو آؤ ہم چل کر کسی دیوتا کا ثالثی فیصلہ لیتے ہیں مگر وہ فیصلہ ہم دونوں کو ماننا پڑے گا۔ کہیے کیا وچار ہے؟

آخر دونوں گوروا اس بات پر رضا مند ہو گئے۔ قرعہ شو شنکر بھولے ناتھ پر پڑا چنانچہ وہ کیلاش پربت پر جا پہنچے۔ سارا معاملہ ان کے سامنے رکھا اور ان کا فیصلہ چاہا کہ "ہم نے ایک دوسرے کو جو دان دیا ہے اُس میں سے کون سے دان کی اہمیت زیادہ ہے اور کس دان کی کم۔" انھوں نے ساری بات سنی۔ سوچ میں پڑ گئے کہ کیا کیا جاوے۔ دونوں اونچے پایہ کی ہستیاں ہیں۔ سچی بات کہنے سے خواہ مخواہ ایک کی ناراضگی لینی پڑے گی ایسے موقعہ پر ٹال مٹول مناسب رہے گی۔ کہنے لگے، "آپ خوب جانتے ہیں کہ میں ہر وقت بھنگ دھتورا اور نشّی چیزوں کا کتنا زیادہ استعمال کرتا رہتا ہوں۔ آپ کو شاید یہ بھی پتہ ہو گا کہ مجھے نیل کنٹھ کیوں کہا جاتا ہے۔ سمندر کے پانی کو بونے سے جو زہر نکلا تھا، وہ میں نے ہی تو پیا تھا اور وہ زہر اب تک میرے گلے میں اٹکا ہوا ہے۔ ان وجوہات سے میرا دماغ صحیح ٹھکانے پر نہیں ہے۔ سوچ وچار کی شکتی ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے میں اس معاملے میں اپنی رائے دینے میں بالکل قاصر ہوں۔ آپ کرپا کر کے برہما جی کے پاس تشریف لے جائیں وہ ضرور اس بات کا بٹوارہ کر سکیں گے۔"

بھولے ناتھ جی سے یہ جواب پاکر اب وششٹ جی اور مُنی جی نے برہما جی کے دربار کی طرف رجوع کیا۔ انھوں نے ساری کہانی ان کے سامنے دُہرائی اور ان کا فیصلہ چاہا کہ۔ ایک ہزار سال کی تپسیا کا پھل اُونچا ہوتا ہے یا ایک کھشن سَت سنگ کا پھل؟ برہما جی بڑے قیافہ شناس تھے دونوں کے اندرونی جذبات کا عکس وہ اچھی طرح دیکھ چکے تھے کہ یہ دونوں حضرات اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ اور ایک معمولی سی بات پر انھوں نے وقار کا سوال بنالیا ہے۔ ایک قسم کا دان بمقابلہ دوسری قسم کے دان کے چھوٹا ہے یا بڑا ہے محض وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ سچی بات کڑوی لگتی ہے۔ ایک کی خوشنودی لازمی طور پر دوسرے کی ناراضگی کا باعث بنے گی۔ اس لیے اپنی جان

چھڑانے کے لیے انھوں نے عذر پیش کر دیا۔" پربھو! آپ پر اچھی طرح روشن ہے کہ بحیثیت
ایشور کے سیکریٹری کے میری ڈیوٹی کتنی سخت ہے۔ کتنی لمبی چوڑی دُنیا ہے۔ ہزاروں طرح کی مخلوقات
ہے۔ اتنے بڑے نظام کو قائم رکھنے کے لیے میری تمام تر توجہ دن رات اُسی طرف لگی رہتی ہے۔ فرصت
کا وقت یا کسی معاملہ پر سوچ کے لیے وقت میرے پاس کہاں؟ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر میں ایک
منٹ کے لیے بھی اپنا دھیان اور کسی طرف لگا دوں تو دُنیا کا نہ جانے کیا حشر ہو۔ اس لیے میرا آپ
سے یہی نویدن ہے کہ آپ شری وشنو بھگوان کے دربار بیکنٹھ لوک (جہاں انسان پہنچ کر
ہمیشہ کے لیے آواگون کے چکر سے نجات پا لیتا ہے۔) میں چلے جائیں۔ وہ پرماتما کے چیف سیکریٹری
ہیں۔ دُنیا کے پالن پوسن کا سارا انتظام انھی کے ہاتھ ہے۔ میں تو صرف پیدائشِ دُنیا کا ذمّہ دار
ہوں۔ وہ ہر لحاظ سے میرے سے اونچے ہیں۔ ان کا فیصلہ ہر لحاظ سے بہترین فیصلہ ہوگا۔"

وششٹ جی اور مُنی جی اب شری وشنو بھگوان کے دربار پہنچ گئے کیوں کہ دل میں جو
بات سمائی ہوئی تھی اس کا فیصلہ ثالثی لینا بھی تو ضروری تھا۔ جب انھوں نے اپنی اپنی بات
وشنو بھگوان کو سُنائی اور اُن سے فیصلہ مانگا تو وشنو بھگوان کو بھی وہی خیال آیا جو پہلے شوشنکر
بھولے ناتھ اور برہما جی کو باری باری آ چکا تھا چنانچہ مصلحت اسی میں سمجھی کہ خواہ مخواہ کیوں ٹانگ
اڑائی جائے۔ ان کے جھگڑے سے کیا لینا؟ ان کو کوئی اور راستہ ہی دکھا دینا چاہیے۔ کچھ سوچ کے
بعد یوں لب کشا ہوئے۔" وششٹ جی اور مُنی جی! آپ کا اِدھر درشن دینا میرے لیے واقعی باعثِ
فخر ہے۔ کیوں کہ میرے دل میں آپ دونوں کے لیے بڑا احترام ہے۔ ایک میری دائیں آنکھ ہے تو
دوسرا بائیں آنکھ مگر مجھے افسوس ہے کہ اس معاملہ میں میں آپ کی کوئی سیوا نہیں کر سکتا۔ اس
کی وجہ بھی سُن لیجیے میری سوچنے کی طاقت میرے دُکھوں کی وجہ سے ناکارہ ہو چکی ہے۔ میرا دُکھ
کوئی معمولی دُکھ نہیں ہے۔ میرے جیسا دکھی تو آپ کو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔"
ایسے کلمات سن کر وہ دونوں گورو بولے۔" مہاراج! ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ کلّی اختیارات
ہیں اور آپ ساری دُنیا کے مالک ہیں پھر دُکھ کاہے کا؟ ہماری یہ ارتھنا ہے کہ اگر زحمتِ خاطر نہ

ہو تو ہمیں کچھ کھول کر سمجھا دیں۔" وشنو بھگوان نے اُن کے چہروں پر اضطراب اور بے چینی نے آثار دیکھے تو کہنے لگے "کسی کی استری اگر اپنے پتی سے دور دور رہے اور ہر وقت پرائے گھروں میں پھرتی رہے تو آپ خود ہی بتلائیے کہ اُس پتی کی حالت کیا ہوگی؟ خاص خاص موقعوں پر اور دیوالی کے تہوار پر گھر گھر لکشمی پوجا آپ نے نہیں دیکھی؟ میں نے آپ کے سامنے ایک روشن حقیقت بیان کی ہے۔ مَن کے اندر اگر دُکھ ہی دُکھ بھرا ہوا ہوگا تو سوچنے کی طاقت کہاں سے آئے گی؟ آپ شیش ناگ جی کے پاس چلے جائیں وہ درست فیصلہ دے سکیں گے۔ دیکھیے انھوں نے دھرتی کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا رکھا ہے اور کبھی ایک لحظہ کے لیے بھی اپنے فرض میں ڈھیل نہیں دکھلائی۔" وشنو کی آواز حلق میں ہی ڈوب کر رہ گئی۔ بھوک پیاس، گرمی سردی کی پروا نہ کرتے ہوئے اب وشِشٹ جی اور منی جی پاتال لوک از زمین کے نیچے شیش ناگ کے پاس جا پہنچے اور انھیں پرنام کیا۔ شیش ناگ جی نے دیکھا کہ مدارجِ عروج طے کرنے والی دو اونچی ہستیاں آئی ہیں۔ انھیں بڑی عزت سے پاس بٹھا کر آمد کی وجہ پوچھی تو انھوں نے سارا قصہ سنا کر ان کا فیصلہ مانگا۔ شیش ناگ جی مدتوں سے پرتھوی کے بوجھ تلے دب رہے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ ایسا زریں موقعہ پھر کب ہاتھ آئے گا۔ ان کی یہاں موجودگی کا کچھ فائدہ تو اٹھانا چاہیے بولے "پرماتما نے جو کچھ بھی بنایا ہے کسی مقصد کو مدِ نظر رکھ کر بنایا ہے۔ رائی ہو یا پربت۔ یہی اصول آپ کی تپسیاؤں پر لاگو ہوتا ہے۔ ہر ایک کی تپسیا یا ست سنگ اپنی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتا ہے اس لیے آپس میں ایسے مقابلے میری نظر میں تو محض بے معنی ہیں اب چوں کہ آپ نپٹارے کی غرض سے میرے پاس آہی گئے ہیں تو میں آپ کو نراش نہیں کرنا چاہتا۔ لہٰذا اب آپ دھرتی کو اتنا ہی دان دیجیے جتنا کہ پہلے ایک نے دوسرے کو اور دوسرے نے پہلے کو دیا تھا۔ آپکے دان سے پرتھوی میرے سر سے ایک بالشت بھر اوپر اُٹھ جائے گی تبھی میرا دماغ کچھ سوچ سکے گا۔" منی جی نے سوچا کہ میرے پاس کئی ہزاروں سال کی تپسیا کا پھل ہے اس میں سے اگر ایک ہزار سال کی تپسیا کا پھل آج دھرتی کو دے دوں تو کونسی کمی آجائے گی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ پرتھوی کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

"اے پرتھوی! آج میں اپنی خوشی سے اپنی تپسیا سے ایک ہزار سال کی تپسیا کا پھل تیرے ارپن کرتا ہوں۔

اسے سوبکار کر اور شیش ناگ جی کے سر سے ایک بالشت اوپر اُٹھ جائے" مگر پرتھوی پران کی بات کا مسلق کچھ اثر نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر منی جی نہ صرف حیران بلکہ شرمندہ بھی ہو رہے تھے۔ اب شیش ناگ نے وشِشٹ جی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور ان سے ایک کھشن ست سنگ کا دان پرتھوی کو دینے کے لیے کہا۔ وشِشٹ جی کی ہچکچاہٹ دیکھ کر منی جی سوچنے لگے کہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے تو ایک ہزار سال کی تپسیا کا پھل پرتھوی کو ارپن کرنے میں ایک سکینڈ بھی نہیں لگایا تھا، مگر وشِشٹ جی بت بنے کھڑے ہیں اور اپنے دان کا اعلان نہیں کر رہے۔ وشِشٹ جی تو منی جی کو اپنے ایک کھشن ست سنگ کے دان کے پھل کی اہمیت جتانا چاہتے تھے۔ آخر کار شیش ناگ نے مہرِ سکوت توڑی "وشِشٹ جی! آپ کس سوچ میں پڑ گئے ہیں" میں جب تک دونوں کے دان کا اثر نہیں دیکھ لیتا، فیصلہ کیسے دے سکوں گا؟ اب زیادہ دیر نہ لگائیے" وشِشٹ جی نے بادلِ ناخواستہ پرتھوی کو ایک کھشن ست سنگ کے دان کا پھل دے دیا۔ بس پھر کیا تھا، پرتھوی شیش ناگ کے سر سے بالشت بھر اُوپر اُٹھ گئی، جسے ان دونوں نے بھی اچھی طرح محسوس کیا تب شیش ناگ جی کہنے لگے "صاحبان! آپ نے اب تو خود اپنی آنکھوں سے اپنے اپنے دان کا پھل دیکھ لیا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ پرتھوی نے کس کے دان کو اونچا مانا ہے۔ میرے خیال میں اب مزید وضاحت کی تو چنداں ضرورت نہیں رہی" وشِشٹ جی تو اس فیصلے سے مطمئن ہو گئے مگر منی جی ضد کے پکے تھے، انھیں یہ فیصلہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ سب چھوٹے وقار کا سوال تھا۔ وقار کو بٹّہ لگ رہا تھا، سٹپٹائے اور کہنے لگے "شیش ناگ جی' اس فیصلے سے میری بالکل تسلی نہیں ہوئی۔ مجھے تو اس کا ثبوت درکار ہے" شیش ناگ جی بھلا ایک اونچی شخصیت کو کس طرح ناراضگی کا موقعہ دیتے۔ اصلیت بھی یہ ہے کہ منصف کا کام بہت ذمّہ داری کا کام ہے۔ یہی نہیں کہ فریقین یہ سمجھیں کہ ان کے ساتھ واقعی انصاف ہوا ہے بلکہ منصف کا یہ بھی کام ہے کہ وہ فریقینِ مقدمہ کو اچھی طرح سمجھائے کہ انصاف کی غرض سے ہر ممکن ذرائع و وسائل استعمال میں لائے گئے ہیں اور انصاف دینے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ کسی کے ساتھ رورعایت نہیں کی گئی۔

اور غیر جانب داری سے کام لیا گیا ہے چنانچہ تسلی بخش ثبوت دینے کے لیے شیش ناگ جی نے ان دونوں کو حسبِ ذیل کہانی سُنائی۔ دروغ بر گردنِ راوی۔

"موربی ہلز (موجودہ ہریانہ) میں کبھی ایک نامی گرامی ڈاکو راجندر المعروف جندا رہا کرتا تھا۔ اس کے پاس ڈاکوؤں کا ایک کافی بڑا گروہ تھا جو ہر قسم کے خطرناک ہتھیاروں سے لیس تھا۔ اپنے چھپنے کے لیے انھوں نے مختلف جگہوں پر پناہ گاہیں بنائی ہوئی تھیں جہاں کسی فردِ بشر کی رسائی تو کیا ہوا کو بھی پہنچنا مشکل تھا۔ پولیس ہر وقت اس گروہ کا تعاقب کرتی رہی مگر ابھی تک گرفتاری میں ناکام ہی رہی۔ آخر جندا کو بڑھاپے نے آن گھیرا۔ قوائے جسم آہستہ آہستہ جواب دینے لگے۔ قوتِ سماعت و قوتِ بصارت میں کافی حد تک کمی وقوع پذیر ہو گئی۔ اسی طرح اور بھی بڑھاپے کی نشانیاں صاف نظر آنے لگیں۔ ماتھے کے شکن اور یہ نشانیاں بیّن طور پر بتلا رہی تھیں کہ مسافر کی منزل اب بالکل قریب ہے وہ چہرے سے بھی اتنا نڈھال نظر آ رہا تھا جیسے کوئی صدیوں کا بیمار ہو۔ کسی نے بجا فرمایا ہے؛

آکر جو نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جا کر جو نہ آئے وہ جوانی دیکھی

اور اب تو باری باری اس کے رفیق بھی داغِ مفارقت دینے لگے جندا کو جب تقریباً یقین ہو گیا کہ میں ایک چراغِ سحری ہوں تو لڑکوں کو اکٹھا کیا اور انھیں کہنے لگا۔ "دیکھو! میرا سمے آ چکا ہے۔ میں صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہوں۔ میں دل میں کوئی حسرت لیے نہیں جا رہا۔ مجھے اب دیر نہیں کرنی چاہیے آپ میری باتیں سُن اور سمجھ لو۔ اس آخری سفر پر میں بھی دوسروں کی طرح خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔ وقتِ رحلت کوئی راجہ تھا یا مہاراجہ یا امیر بادشاہ سب ہاتھ خالی کفن سے باہر نکلے ہوئے تھے تو میں کون ہوں؟ تمھارے لیے میں نے اپنی زندگی میں بے شمار گناہ کیے ہوں گے لیکن میں نے کبھی کسی یتیم یا بیوہ کی آہ نہیں لی کیوں کہ میں اچھی طرح جانتا تھا

کہ اُن کی آہ عرش بریں پر بہت جلدی سُنی جاتی ہے۔ امیروں کو زرداروں کو لوٹتا ہے مگر کئی یتیموں، بیواؤں کو مقررہ وظیفہ بھی دیتا ہے۔ اپنے مال سے باقاعدہ زکوٰۃ نکالتا ہے۔ کیوں کہ:

زکوٰۃِ مال بدر کُن کہ فضلۂ رزرا
چو باغباں ببرد بیشتر دہد انگور

(اپنے مال و دولت سے زکوٰۃ دے کیوں کہ جب مالی انگور کی فالتو شاخوں کو کاٹ ڈالتا ہے تو انگور زیادہ پھل دیتا ہے۔) میں تمھیں چند مفید مطلب نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں امید ہے آپ ان پر عمل پیرا ہوں گے۔ میں ایک بات اور بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم میں سے کوئی ان پر عمل نہ کرنا چاہے تو میرے ساتھ جھوٹا وعدہ نہ کرے مجھے کوئی افسوس نہ ہوگا لیکن وعدہ دے کر پھر خلاف ورزی کرنا ایک انتہائی گھاٹے کا سودا ہوگا۔ اور بعد میں ساری عمر اسے پچھتانا پڑے گا۔ سب لڑکوں نے نصیحتوں پر عمل کرنے کا جب وعدہ دے دیا تو جنداڈاکو نے انھیں بستر مرگ سے یوں خطاب کیا "ست سنگ کو قطعی تیاگ دینا۔ اگر کسی جگہ پر ست سنگ ہو رہا ہو تو اُس طرف سے گذرنا بھی نہیں۔ برہمنوں کی عزت کرنی چاہیے اور نہ کسی طرح کی سیوا۔ جس جگہ کوئی گیانی دھیانی، پنڈت، قاضی، ملّا وغیرہ لیکچر دے رہے ہوں وہاں سے بچ کر نکل جانا:

سودا کبھی نہ مانیو واعظ کی گفتگو
آوازہ دہل ہے خوش آیند دور کا

ان لوگوں کے اُپدیشوں کا آپ کی ذات پر اور آپ کے پیشہ پر ہمیشہ بُرا اثر پڑے گا۔ اپنے کام پر جانے سے پہلے پُورے اعتقاد اور یقین سے دیوی دیوتا، پیر و مُرشد کی مقدس جگہ اور دربار پر پہنچنا، سر جھکانا اور کمائی کے بعد مقررہ حصّہ ان کے پہنچانا۔ اس صدق دلی سے آپ کے کام میں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی ہوگی اور جان بھی محفوظ رہے گی"۔

اس کے جلد ہی بعد بوڑھے جندا کی جانکنی کا وقت آگیا۔ اس کی جان تو بڑی مشکل سے نکل رہی تھی، وہ خود بھی تنگ تھا اور گھر والے اپنی جگہ پر تنگ تھے۔ جانِ زار عجب کشمکش میں پھنسی ہوئی تھی۔ گذشتہ زندگی کے دن، اپنا بچپن، اپنی جوانی، ساتھیوں کی ناقابلِ فراموش یادیں باری باری سب نظروں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ اپنے افعالِ قبیحہ کی یاد سے دل ہی دل میں شرمساری محسوس کر رہا تھا کہ پروردگار نے مجھے دُنیا میں کس غرض کے لیے بھیجا تھا اور میں نے انسانی جامہ میں رہ کر ایسے رذیل کام کیے کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے، مگر: اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ غصہ نے اب اس کے دماغ پر پُورا قبضہ کر رکھا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے سے لڑائی اور بیوی سے بھی لڑائی، گھر والے ہر وقت دست بدُعا رہتے "اے مالک! تُو اب اس بوڑھے کو اٹھا لے اور اپنے چرنوں میں جگہ دے۔ اس کا دُکھ اب ہم سے نہیں دیکھا جاتا" مگر موت کا تو وقت معیّن ہے بوڑھا اسی طرح چند دن اور زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔ ایک دن وہ تقریباً ٹھیک ہو گیا مگر کسی سمجھدار نے بتلایا کہ موت سے پہلے عام طور پر امراض مریض کو چھوڑ جاتی ہیں اور اب آخری وقت عنقریب ہے۔ اگلے ہی دن بولنے کی طاقت قدرے سلب ہونے لگی۔ ضعفِ قلب کا ہلکا سا دورہ ہوا موت کو بھی تو آخر کوئی بہانہ چاہیے، اس کی آنکھوں کو کچھ مہیب عکس نظر آنے لگے تو ارد گرد جو خویش و اقارب مجتمع تھے، اُنھیں اشاروں ہی سے کچھ اس طرح سمجھانے لگا "فرشتۂ اجل وہ آیا، وہ سامنے آیا اور شیر چیتے اور بے شمار زہریلے سانپ اور بچھو مجھے کاٹنے کو آسمان سے نازل ہو رہے ہیں مجھے کہیں ان سے چھپالو، نہیں تو یہ مجھے کھا جائیں گے۔" ایسی نیک رُوح کا استقبال آخر اور کون کر سکتا ہے؟ زاں بعد یمدُوت نے اپنی شکل دکھلائی۔ بوڑھا ڈاکو بڑی التجا سے اُسے کہنے لگا "فرشتے! ایک چھوٹی سی خواہش میرے دل میں ابھی رہ گئی ہے، تھوڑے دن تو انتظار کر لے تو میں اس خواہش کی بھی تکمیل کر لوں۔ ہمارے سامنے والی ریاست کا راجہ بڑا ظالم ہے جس نے امیروں اور غریبوں کا خون نچوڑ کر اپنے خزانے مال و زر سے بھر پُور کیے ہیں۔ یہ ناجائز طریقوں سے کمائی ہوئی رقم صرف اپنے عیش و آرام اور لوگوں کی دلآزاری پر ہر وقت خرچ کرتا رہتا ہے۔ بہبُودی اور رفاہِ عامہ کے کاموں کے تو وہ نزدیک بھی نہیں جاتا۔

میں نے من میں پکا ارادہ کیا ہوا تھا کہ اس کے خزانے لوٹ کر غریب مستحق حاجت مندوں کو بانٹوں گا مگر زندگی اب یاری نہیں کر رہی۔ تو مجھے اپنی آمد سے پہلے کوئی پروانہ بھیج دیتا تو میں اپنا کام اس وقت تک مکمل کر چکا ہوتا"۔ یمدوت کہنے لگا "دیکھ جندا! تیرے گلے اور شکوے محض بے بنیاد ہیں۔ میں نے تمہیں کئی نوٹس (پریم پتر) بھیجے۔ پہلا پتر بھیجا جب تیری سننے کی طاقت میں کمی آئی۔ دوسرا خط بھیجا جس سے تیری نظر کمزور ہو گئی۔ تیسرا خط پہنچنے پر تیرے بال سفید ہو گئے زاں بعد قوتِ حافظ تجھے جواب دے گئی جندا اگر تم نے ان پروانوں کا مطلب نہیں سمجھا تو قصور کس کا ہے؟ گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمہ آفتاب را چہ گناہ؟ اگر چمگادڑ کو دن کے وقت سورج کی روشنی نظر نہیں آتی تو اس میں سورج کا کیا گناہ ہے؟ اب تو تیرا آخری وقت آگیا ہے' تیار ہو جا۔ بوڑھے ڈاکو نے اپنے سب سے بڑے لڑکے مہندرو کی طرف التجا بھری نگاہوں سے دیکھا اور اشاروں اشاروں میں ہی اسے اس کام کے لیے سمجھا دیا جو وہ خود ادھورا چھوڑ کر رحلت کر رہا تھا: ہرچہ پدر نکند پسر تمام کند (باپ اگر کوئی کام نہیں ہو سکا تو اب بیٹا اسے پورا کرے)

آخر وہ چراغ سحری بجھ گیا۔ شمع بجھنے کے بعد دھواں اٹھتا ہے۔ گھر میں آہ وزاریاں شروع ہو گئیں اور اب اس مردہ کو ٹھکانے لگانے کی جلدی جلدی تیاری شروع ہو گئی۔ موت دوپہر کو ہوئی' شام سورج غروب ہونے سے پہلے میت کو سپردِ آتش کیا جانا ضروری تھا۔ ڈاکو کی بیوی بھی پُرزور الفاظ میں لواحقین کو کہہ رہی تھی کہ "اب دیر مت لگاؤ۔ اس مٹی کی ڈھیری کو فوراً شمشان گھاٹ لے جاؤ کہیں رات کو پہرہ نہ دینا پڑے"۔ آخری دیدارِ میت کے لیے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ آخر جنازہ اٹھا اور لوگ مردے کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے تیزی سے شمشان گھاٹ کی طرف رواں دواں جا رہے تھے اور شاعر کے اس قول کی تائید ہو رہی تھی:

تابوت تو تھا کندھوں پر' روح ملکِ عدم میں
کوسوں ہی دور نکل گیا پیدل سوار سے

ایک دن جب سب مہمان چلے گئے اور تمام مذہبی رسومات سے وہ فارغ ہو گئے تو بھائیوں نے آپس میں بیٹھ کر ڈاکہ زنی کی غرض سے اپنے اپنے علاقے بانٹ لیے تو مہندرو نے ساتھ والی ریاست کے دارالخلافہ نوشہرہ کی طرف رُخ کیا تاکہ مرحوم باپ کے ساتھ کیے گئے وعدے کو پُورا کر سکے۔ مسافت پندرہ بیس کوس کی تھی۔ راستہ میدانی اور پہاڑی علاقے میں سے گذرتا تھا۔ وہ عمداً گھُمن گھیر راستوں سے گذر رہا تھا۔ کہیں کوئی جوتا پہن لیتا اور کہیں کوئی اور جوتا اور بعض دفعہ چٹانوں پر پیر رکھتا تو کہیں بالکل جوتے کے بغیر۔ خوب جانتا تھا کہ چور اور ڈاکو اپنے پاؤں کے نشانوں سے ہی اکثر قابو آتے ہیں۔ اتفاقاً اسے راستے میں ایک اور راہ رَو مل گیا۔ مہندرو نے پوچھا "بھائی صاحب! کیا یہی راستہ نوشہرہ کو جاتا ہے؟" وہ راہ رَو بولا "جی ہاں! آپ صحیح راستے پر گامزن ہیں۔ نوشہرہ یہاں سے صرف چار پانچ کوس رہ گیا ہے۔ دیکھنا ریاست کی سرحد پر ایک گاؤں سرہالی آئے گا۔ میں بھی وہیں سے آ رہا ہوں۔ وہاں اس وقت ایک بڑے وِدوان مہاتما ست سنگ کر رہے تھے۔ سننے والوں کا ایک جمِ غفیر لگا ہوا تھا۔ وہاں سے جانبِ مشرق مڑ جانا تو نوشہرہ پہنچ جاؤ گے۔" مہندرو چلتا گیا۔ سرہالی گاؤں کے ابھی باہر ہی تھا کہ واقعی ست سنگ کی دھیمی دھیمی آواز کانوں میں پڑنے لگی۔ باپ کی نصیحت پر عمل کرنا بھی ضروری تھا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ نہ وہ وہاں ٹھہر سکتا تھا، نہ ہی وہاں سے بھاگ سکتا تھا۔ دل میں فیصلہ کیا کہ پنڈال سے جتنا بھی دُور رہ سکوں اُتنا ہی اچھا ہو گا، اور اگر بفرضِ محال کان میں ست سنگ کا کوئی شبد آنے لگے تو دونوں کانوں میں اچھی طرح سے انگلیاں ٹھونس لوں گا۔ اِس ارادہ سے آگے بڑھتا ہی گیا۔ جونہی کانوں میں ست سنگ کے الفاظ آنے کا احتمال ہوا تو اس نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ قدرت کا کرنا کیا ہوا کہ اچانک ایک پَیر میں کانچ کا ٹکڑا دھنس گیا۔ چلنا محال ہو گیا۔ ایک کان سے ایک انگلی نکالی اور کانچ کا ٹکڑا نکال دیا۔ اسی دَوران مہاتما جی کا ایک شبد مہندرو کے کانوں میں چیرتا ہوا پہنچ ہی گیا۔ "دیوی دیوتاؤں کا سایہ نہیں ہوتا۔" مہندرو کے خلافِ مرضی یہ فقرہ اس کے دل میں جا کر اس طرح جاگزیں ہو گیا کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا پر اب کر بھی کیا سکتا تھا۔ آخر چلتے چلتے اپنی منزلِ مقصود پر جا پہنچا۔ اندھیرا اچھا

گیا تھا مہندرو نے دیکھا کہ خزانے کا پہریدار شراب پی کر اوندھا پڑا ہوا ہے۔ اپنی ڈیوٹی سے غافل ہے، اور خزانے کے نزدیک ہی ایک درخت سے ایک اونٹ بھی بندھا ہوا ہے۔ اس نے موقع غنیمت جانا۔ غیبی امداد کا معترف تھا اس نے جلدی جلدی سے خزانہ کی صفائی کی۔ مال و زر نکال کر باہر لے آیا اور اونٹ پر لاد کر پہلے کی طرح ٹیڑھے میڑھے راستوں سے پوری چوکسی اور ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے نظر بچا کر وہاں سے اپنے گاؤں بستی گوجراں پہنچ گیا۔ یہ بستی ڈاکوؤں اور چوروں کی تھی۔ عرفِ عام میں اسے چور بستی کہا جاتا تھا۔ سالہا سال تک کبھی کوئی ریاست کا سرکاری ملازم چھوٹا یا بڑا اس بستی میں داخل نہیں ہوا تھا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی غیر کو اس بستی میں داخلہ کی جرأت ہی نہیں ہوئی تھی۔ سرکاری اہل کار اس کے نام سے ہی کانپتے تھے۔ مہندرو نے سوچا کہ اس طرح کم از کم سورگیہ باپ کی روح کو تو ضرور تسکین ملی ہو گی کیوں کہ اس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا تھا۔ اب اس نے بڑی بے دردی سے اس اونٹ کو قتل کیا۔ گھر کے اندر ہی دو بڑے گڑھے کھودے۔ ایک میں مردہ اونٹ دبا دیا اور دوسرے میں لوٹا ہوا خزانہ۔ اور بڑی تسکین سے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ سرکاری خزانے کے لوٹے جانے کی خبر سے ریاست کے ہر شہر، گلی کوچے میں ایک قسم کا تہلکہ سا مچ گیا۔ ہر جگہ پر صرف اسی موضوع پر باتیں ہو رہی تھیں۔ لوگ حیران ہو رہے تھے کہ اگر سرکاری خزانے کی حفاظت کا یہ حال ہے تو لوگوں کی جان اور مال کا کیا ہو گا؟ ہر طرف پولیس کے انتظام پر لے دے ہو رہی تھی۔ پولیس اور خفیہ پولیس کی نالائقی پر محمول کیا جا رہا تھا۔ راجہ نے ذمّہ دار افسروں کی میٹنگ بلا کر انھیں بھلا کہا، اور کسی نہ کسی طرح سے چوری کا سراغ لگانے کے لیے سخت احکام صادر کیے۔ چنانچہ ہر طرف ناکہ بندی اور دیگر تمام ذرائع استعمال میں لائے گئے مگر چور تو کبھی کا کہیں پہنچ چکا تھا، قابو کیسے آتا؟ ایک بات جس پر سب ارکانِ سلطنت متفق تھے وہ یہ تھی کہ ڈاکو اونٹ پر گیا ہے۔ بستی گوجراں کے اینٹی سوشل عناصر کے متعلق کافی مواد پولیس کے قبضہ میں تھا۔ لہٰذا یہ فیصلہ رائے عامّہ سے ہوا کہ تمام تر توجہ اس بستی کی طرف ہی لگائی جائے۔ اونٹ کے پاؤں کے نشان بھی اسی بستی کی طرف جانے کی اطلاع ملی تھی۔ میٹنگ میں ایک اہل کار بھی بستی گوجراں جا کر

پتہ لگانے کی ڈیوٹی لینے کو تیار نظر نہ آرہا تھا، مگر قابلِ تعریف ہے۔ شریمتی ریشماں کی جرات جس نے اکیلے اُس گاؤں سراغ رسانی کی ذمہ داری اپنے اوپر لی، اور ایسے گاؤں جانا قبول جس میں داخلہ موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا یہ بات نہ صرف دوسروں کے لیے حیران کُن تھی بلکہ مرد ملازمین کے لیے تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے:

نہ ہر زن زن است ، نہ ہر مرد مرد
خُدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

(جس طرح ہاتھ کی سب انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح مرد اور مرد میں اور عورت عورت میں بھی فرق ہوتا ہے) وہ خفیہ پولیس میں ہیڈ کانسٹبل کے عہدہ پر تعینات تھی۔ اس کا بچاؤ منظور ہو گیا تو اس نے بھکارن کا بھیس بنا کر بستی گوجراں کی راہ لی۔ وہاں پہنچ کر اس نے باری باری ہر چوک پر آواز لگانی شروع کی۔ آواز سوز اور درد سے بھری ہوئی تھی اس لیے راہ چلتے بھی دو منٹ کے لیے رُک کر اس کی دُکھ بھری کہانی سُن کر ہی آگے جاتے۔ کام کرنے کا طریقہ ہر ایک کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔ جب وہ رقت آمیز لہجہ میں بولی" بھائیو اور بہنو! کرپا کر کے مجھ بدقسمت بیوہ کی پکار تھا سنیے۔ میرا اکلوتا لڑکا ایک مہلک مرض میں مبتلا ہے، آج کل کا مہمان ہے۔ ہمارا اس دُنیا میں اور کوئی ہمدرد و غم گسار نہیں ہے اس لیے آپ کے آگے ہاتھ پسارتی ہوں۔ میرے اوپر رحم کرو، میری امداد کرو تاکہ میرا نوجوان لڑکا بچ جائے۔ میں ساری عمر آپ کے احسان تلے دبی رہوں گی اور اپنے محسن کی داسی بن کر رہوں گی۔ جو دیا کرے اُس کا بھی بھلا، جو نہ کرے اُس کا بھی بھلا۔ میرا یہاں زور تھوڑا ہی چل سکتا ہے۔ میری پکار تھا پر ہمدردانہ غور فرمائیے۔ اور آج دل کھول کر مدد کیجیے۔ پرماتما تمہارا بھی بھلا کرے گا۔" یہ کہانی شیش ناگ جی اُن دونوں کو سنا رہے ہیں۔ عام طور پر لوگ اس کی بات سُنی اَن سُنی کر کے اپنی اپنی راہ لیتے مگر ایک عورت پر ریشماں کی آہ و زاری نے اپنا پورا اثر دکھلایا، وہ چوک پر رُک کر ریشماں سے پوچھنے لگی۔

"بہن! تیرا رونا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ تیرے آنسو میرے کلیجے پر پڑ رہے ہیں اور اسے چھید رہے ہیں۔ رومت اور اپنے من کی بات آہستہ سے میرے کان میں بتلا دے۔ تیری یہ آہ و زاری مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ سچ مچ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تیرا لڑکا نہیں بلکہ میرا اپنا لڑکا بیمار ہے۔ یہاں پر ماتما کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔ تجھے روپے پیسے کی ضرورت ہے یا کھانے پینے کے سامان کی؟ جو چاہو گے مل جائے گا۔ وہ انسان ہی کیا جو بیماری اور تکلیف کے وقت دوسرے کی دستگیری نہ کرے۔ ایسے وقت میں ایک دوسرے کے کام انسان ہی آتا ہے اور یہی ہمارا دھرم ہونا چاہیے۔" ریشماں اس عورت کے یہ حوصلہ افزا الفاظ سُن کر اپنے دل ہی میں خوش ہو رہی تھی کہ آخر کسی نے تو اس کی فریاد پر غور کیا۔ منہہ بسورتے ہوئے اُسے کہنے لگی: "پرماتما تمھارا بھلا کرے، تمھارا پتی ہمیشہ سلامت رہے تمھارے بیٹے سدا سُکھی رہیں۔ مجھے حکیم کی ہدایت کے مطابق صرف ایک ڈیڑھ سیر تازہ مرے ہوئے اُونٹ کا گوشت درکار ہے اور گوشت کی منہ مانگی قیمت دینے کو بھی میں تیار ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" "بس اتنی سی بات تھی؟ یہ تو میرے لیے ایک معمولی سا کام ہے۔ تو میرے ساتھ میرے گھر تک چل۔ میں تجھے کھڑے کھڑے ہی اُونٹ کا گوشت لا کر دے دوں گی۔ مگر ایک بات اپنے پلّے باندھ لے کہ اس بات کا تذکرہ کہیں میرے ہمسایوں سے نہ کر دینا اگر اس بات کی کہیں بھنک بھی میرے پتی کے کانوں میں پڑ گئی تو وہ میرا لہو چوسنے لگا کیوں کہ اس کے پاس خونریزی کے لیے طرح طرح کے ہتھیار رکھے ہوئے ہیں۔ آدمی کی جان لینا تو وہ اس طرح سمجھتا ہے جس طرح گاجر مولی کاٹ دینا۔ تیرے بچے کو آرام دینا تو اب پرماتما کے ہاتھ ہے۔" یہ سخی اور رحم دل عورت مہندرو ڈاکو کی بیوی ہی تو تھی۔ ریشماں نے رونا دھونا بند کر دیا، اور اس عورت کے ساتھ مہندرو ڈاکو کے گھر پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر ڈاکو کی بیوی نے ریشماں کو ایک خفیہ جگہ پر بٹھا دیا اور منٹوں ہی میں گوشت لا کر اس کے حوالے کیا۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ ریشماں نے اُس عورت کا ہزار بار شکریہ ادا کیا۔ رخصت لے کر گھر سے باہر نکل آئی۔ ڈاکو کی بیوی نے اُسے گھر سے باہر نکالتے ہی اندر سے کُنڈی لگا لی۔ ریشماں بڑی خوش تھی کہ تیر ٹھکانے لگا اور ساتھ ہی اُس عورت کی سادہ لوحی پر ہنس بھی رہی تھی۔ ریشماں

کا ابھی سی۔ آئی۔ ڈی کے عہدہ دار کی حیثیت سے کام ختم نہیں ہُوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کچھ نیلا رنگ چھپا کر لائی ہوئی تھی۔ موقعہ تاڑ کر اس نے مکان کے ایک دروازے پر نیلے رنگ سے نشان لگا دیا تاکہ بعد میں اس مکان کی نشاندہی میں کسی قسم کی دقّت نہ آئے۔ اپنا سارا کام اس طرح مکمل کر لینے کے بعد ریشماں نے اپنے گھر کی طرف رجوع کیا۔ اُس کے چہرے پر اب شاداب ہنسی تھی۔ دو چار دن کا سفر طے کر کے مٹکتی مٹکتی دربار پہنچ گئی اور بھری میٹنگ میں ساری داستان کہہ سُنائی۔ سب افسر اس کی ہوشیاری اور کارگذاری پر عش عش کرنے لگے اور سب طرف سے داد و تحسین کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ راجہ بہادر بھی اُس کے کام سے بہت خُوش ہوئے۔ کہنے لگے "میں ہر ایک افسر کا کام بنظر غائر دیکھ رہا ہوں۔ آج مابدولت کو ریشماں کے کام سے انتہائی خُوشی ہو رہی ہے۔ اس کارکردگی کے سلسلہ میں یقیناً وہ ترقی پانے کی مستحق ہے۔ ڈاکو کا اس نے پتہ لگا لیا۔ اس کے گھر کا بھی پتہ لگا لیا۔ اسے زندہ گرفتار کر کے ہمارے پیش کرنا اب اونچے عہدے کے افسروں کا کام ہے"

اُدھر مہندرو جب اپنے گھر شام کو آیا تو اچانک اس کی نظر مکان کے ایک دروازہ پر اُسی نیلے نشان پر جا پڑی۔ سمجھ گیا کہ اس نشان کے پیچھے ضرور کوئی بھید ہے اور یہ کسی سرکاری آدمی کی شرارت ہے۔ فوراً ہی بیوی کو بلا کر اُس سے پُوچھا کہ "آج ہمارے گھر میں کون آیا تھا اور کیا بات چیت ہوئی تھی؟" اُس سادہ لوح عورت نے شروع سے آخر تک ساری کہانی کہہ سُنائی۔ مہندرو نے اسے بڑی لعن طعن کی بلکہ مارنے تک کی بھی نوبت آئی۔ مہندرو یہ سمجھ کر کہ ابھی کوئی خاص نقصان نہیں ہوا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً اسی طرح کا رنگ لے کر چوکسی سے تمام لوگوں کے گھروں پر بھی اندھیرے میں ویسے ہی نشان لگا دیے اور دلجمعی سے جا کر سو گیا۔

چند ہی دونوں میں راجہ کے عتاب سے بچنے کے لیے پولیس کے چند افسر بستی گُوجراں پہنچ گئے۔ انھوں نے جب سب مکانوں پر نیلے رنگ کا ایک جیسا نشان دیکھا تو تذبذب میں پڑ گئے۔ کچھ سمجھ نہ آیا کہ ڈاکو کا گھر کون سا ہے۔ وہاں تفتیش تو ممکن نہ تھی۔ مجبوراً واپس دربار جا کر اپنی ناکامی کی رپورٹ پیش کی۔ راجہ نے اُنھیں کافی جھاڑ دی اور اس حد تک کہہ دیا کہ تم لوگوں سے مستعدی، عقلمندی اور

فرض شناسی میں ریشماں سب سے بڑھ چڑھ کر ہے اور وہیں میٹنگ میں ہی اسے حوالداری سے تھانیداری کے عہدے کی ترقی بھی دے دی۔ ریشماں مَردوں جیسا دل گردہ رکھتی تھی اور آج اسے وہ ترقی بھی مل گئی جس کے خواب وہ عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کھڑی ہو کر راجہ بہادر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "سچی سرکار! دائم سلامت رہو۔ آپکے فرمان کے مطابق میں نے ہی بستی گوجراں دوبارہ جانے کا قصد کر لیا ہے۔ اب کے وہاں ایسا نشان لگا کر آؤں گی کہ جاتے ہی چور کے گھر کا آسانی سے پتہ لگ سکے۔ مجھے ان لوگوں کے داؤ گھات معلوم ہو چکے ہیں۔ میں نے آپکا نمک کھایا ہے، میں نمک حلال ہونے کا ثبوت دوں گی۔ آپ کی نظرِ کرم و عنایت کی طلب گار ہوں۔ آپکا ہاتھ میرے سر پہ چاہیے اور اب مجھے اجازت بخشیے۔"

ریشماں نے اب کالی دیوی کا روپ اختیار کیا۔ بستی گوجراں پہنچ کر اس نے ایک رات کو اپنے ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے ہاتھ میں مشعل لے کر مہندرو ڈاکو کے مکان کی اُس چھت پر جا دھمکی جہاں وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اندھیری کالی رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ریشماں ایک زوردار گرج سے چلائی "او مردود! سفلہ ناحق شناس! تو اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا۔ میری منت مان کر تو نے کچھ عرصہ پہلے سرکاری خزانے پر ڈاکہ ڈالا۔ تو اتنا مالِ غنیمت وہاں سے لایا کہ تیری پشتہائے پشت تک ختم نہ ہو۔ مگر تو نے آج تک میرے دربار پر چڑھاوا نہیں چڑھایا۔ اگر دو دن کے اندر اندر تو دربار پر حاضر نہ ہوا تو تیرے خاندان کو میں بھسم کر دوں گی۔" اتنے سخت الفاظ سن کر مہندرو کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ دُزدیدہ نگاہوں سے وہ اچھی طرح دیکھ چکا تھا کہ سامنے ایک عورت کھڑی ہے جس کے کھلے ہوئے بے ترتیب بال اُس کے شانوں پر گر رہے ہیں اور اس کے ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے ہاتھ میں ایک مشعل ہے جیسے کالی دیوی ہوتی ہے۔ مہندرو بھی بڑا چالاک تھا۔ مصلحتِ وقت دیکھ کر اس نے عورت کو تو باتوں میں لگائے رکھا اور آہستگی سے اپنے سرہانے کے نیچے سے اپنا خنجر نکال لیا۔ ہتھیار سے اب اس کے دل کو ایک قسم کی تقویت مل گئی۔ بُرا ہو اُس مشعل کا جس کی روشنی میں مہندرو کو اس عورت کا سایہ صاف دکھائی پڑ گیا۔ ساتھ ہی سرہالی گاؤں کی سنت سنگ میں کہی ہوئی مہاتما کی وہ بات کہ "دیوی، دیوتاؤں کا سایہ نہیں ہوتا۔" اب

تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی، اس نے صحیح نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ عورت ایک سادھارن عورت ہی ہے کیوں کہ اس کے ساتھ تو سایہ جُڑا ہوا ہے۔ یہ دیوی ہرگز نہیں ہے۔ اس لیے اب وہ گرج کر عورت کو کہنے لگا "شیطان کی خالہ آفت کی پرکالہ! تو ابھی اپنی کمینہ حرکتوں سے باز نہیں آئی تیرے ترکش میں کیا ابھی اور تیر رہ گیا تھا جو آج پھر منحوس قدم ادھر رکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج تو تیری موت تجھے ادھر کھینچ لائی ہے۔ اب تیار ہو جا" ریشماں بیچاری بے ساختہ شور و شیون کرنے لگی۔ مگر وہاں اُس کی سُنتا کون ؟ مہندرو نے عورت پر خنجر سے وار کیا اور اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ اس واقعہ کے دو نتیجے نکلے۔ ریشماں تو راجہ کی خوشنودی حاصل کرنے اپنے ساتھیوں سے طرۂ امتیاز حاصل کرنے کی ناکام کوشش میں ڈیوٹی کرتے کرتے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ وہ ڈیوٹی کو پرماتما کی بندگی کا درجہ دیتی تھی اور اپنے ہمراہیوں کو اکثر یہ بھی کہتے سُنی گئی تھی کہ زندگی میں اگر جد و جہد نہ ہو تو وہ موت ہے۔ اس طرح سے اُس کی ضرورت سے زیادہ چالاکی اور ہوشیاری اُس کی جان لیوا ثابت ہوئی۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ مہندرو کی جان بچ گئی اور وہ بھی صرف ان چند الفاظ کی بدولت جو اس نے سرہالی گاؤں کے مہاتما کے ست سنگ میں کہے ہوئے سُن لیے تھے۔ یہ الفاظ اس نے دُور سے ہی سنے تھے اور وہ بھی بالکل خلافِ مرضی۔ اس وجہ سے وہ اب ست سنگ کا تہہِ دل سے قائل ہو گیا اور ست سنگ کے وچاروں کو اپنانے کا خیال اس کے دماغ میں سما گیا۔" شیش ناگ جی یہ کہانی اُن دونوں گوروؤں کو سُنا رہے ہیں۔

راجہ نے ریشماں کی مہم سے واپسی کی چندے انتظار کی مگر اُس نے واپس کیا آنا تھا۔ راجہ کو خزانہ کی چوری والا مسئلہ بڑا دق کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اُسے اپنے سرکاری اہل کاروں کی قابلیت کا بھی خوب پتہ تھا کہ ڈاکو کو پکڑنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے اُس نے ڈاکو کی گرفتاری کا ایک انوکھا طریقہ اپنایا۔ اس نے اپنی تمام قلم رو کے علاوہ ارد گرد کی ریاستوں میں بھی یہ مشتہری کر دی کہ اگر ڈاکو از خود ہمارے پیش ہو جائے تو ہم اس کے تمام گناہ معاف کرنے کے علاوہ اُسے انعام اکرام سے مالا مال کریں گے۔ مہندرو نے بھی یہ اعلان سُنا۔ اُس کی طبیعت میں جو بُرائیاں تھیں۔

اُن پر اب اچھائیاں غالب آرہی تھیں۔ اُس نے ایک دن بغیر کسی کے صلاح مشورہ کے مالِ مسروقہ جوں کا توں ساتھ اُٹھایا اور جا کر راجہ کے دربار میں پیش ہو گیا۔ راجہ نے اپنا وعدہ حرف بحرف نبھایا۔ مہندرو کے گناہ معاف کر دیے اور اُسے بہت انعام اکرام بھی دیا۔ اس کے علاوہ اُسے اپنے مقرّبانِ خاص کے زُمرہ میں شامل کر لیا۔ مہندرُو کی راست بازی اور چوری شدہ تمام مال کی واپسی سے راجہ کو انتہائی خُوشی ہو رہی تھی۔ ان واقعات کے زیرِ اثر مہندرُو کے خیالات میں اب ایک زبردست انقلاب آچکا تھا اور اُس کی زندگی ایک نئے موڑ میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ اب ایک ڈاکو نہ تھا بلکہ ایک باعزت شہری اور معتمد درباری تھا۔ رُوپے پیسے کی فراوانی تھی۔ خُوب پُن دان کرنے لگا اور کہنے لگا کہ "پروردگار نے مجھے جو اتنا مال و زر دیا ہے۔ میں صرف اس کا نگہبان بن کر بیٹھنا نہیں چاہتا بلکہ اسے مستحق غریبوں میں بانٹنا میرا دھرم اور ایمان ہونا چاہیے۔" شیش ناگ جی منی جی کی طرف روئے سخن کر کے اُن سے دریافت کرتے ہیں "منی جی! اب آپ کو ایک کُشن ست سنگ کے پھل کی اہمیت کا پتہ لگ گیا یا نہیں۔ کوئی شک و شبہ تو نہیں رہ گیا؟ یہ فیصلہ اگرچہ میں نے اپنی دانست کے مطابق دیا ہے مگر دیا ہے پورے غور و خوض کے بعد اور اس پر طرہ یہ کہ فیصلہ دلیل بالا سے آراستہ ہے۔ امید ہے آپ دونوں صاحبان میرے نقطۂ نظر کو سمجھ گئے ہوں گے اور اس سے متفق بھی ہوں گے۔ ہمارے شاستروں اور گرنتھوں میں ست سنگ کی مہما پر بہت ہی زور دیا گیا ہے۔ میں آپ کو بھی مختصراً اس بارہ میں کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔ ست پرشوں اور برہم رشیوں کے پاس جانے اور اُن کے خیالات کو اپنانے کا نام ست سنگ ہے۔ یہ مہا پُرش اپنے خیالات وقتاً فوقتاً اپنے اپنے طریقے سے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کے اُپدیش کا ایک ایک لفظ چوں کہ ان کے وسیع تجربہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ اس لیے وہ باتیں ہمارے دل میں بیٹھ جاتی ہیں۔ انسان ایک سماجک پرانی ہے۔ اس کا ماحول اُس پر گہرا اثر کرتا ہے۔ اچھی صحبت انسان کو لازمی طور پر اچھا بناتی ہے اور بُری صحبت بُرا بناتی ہے۔ ست سنگ میں جانے سے انسان کو چوں کہ ٹھوکر پر ٹھوکر لگتی رہتی ہے۔ اس طرح سے اُسے اپنے اس جنم اور اگلے جنم میں سُدھار کا موقع ملتا ہے۔

ظاہری طور پر بیشک ہماری آنکھیں کھلی رہتی ہیں مگر باطنی آنکھ صرف ست سنگ سے ہی کارگر بنے گی، یہ ایک رُوحانی غذا ہے جس سے موجودہ اچھائیاں اور نیکیاں اور بھی چمکیں گی اور مورکھ آدمی بھی گنوان بن سکتا ہے۔ ست سنگ سے رُوحوں میں بالیدگی، اعتدال اور صفائی کے علاوہ دل کو غمی خوشی میں حوصلہ اور ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ ست سنگ ملتا بھی صرف پروردگار کی بخشش سے ہے۔ اس سنسار رُوپی بھوساگر سے پار اُترنے کے لیے صرف کتھا کیرتن کی ناؤ کام دے سکتی ہے۔ یہ سب کچھ سُن کر دونوں گورُو مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے شیش ناگ جی کا شکریہ ادا کیا اور اپنے اپنے آشرم کی راہ لی۔ شیش ناگ کو بھی دھرتی کا بوجھ اٹھانے سے قدرے راحت ملی۔ ہر عقل مند انسان ایسے فیصلے پر عش عش کرے گا۔ فریقین اپنی جگہ پر خوش ہنصف اپنی جگہ پر خوش۔ کسی نے سچ ہی تو کہا ہے:

اِک گھڑی، آدھی گھڑی اور آدھوں سے بھی آدھ
سنت ملن اور ہری بھجن ہرے کوٹی کوٹی اپرادھ

(سنتوں کی صحبت اور پرماتما کا بھجن خواہ کتنے تھوڑے عرصہ کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کے ہزاروں بلکہ لاکھوں گناہوں کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔)

○

نیک باپ بیٹا

اولڈ فرید آباد (ہریانہ پرانت) میں کسی وقت ایک غریب برہمن رہا کرتا تھا۔ اتفاق سے اُس کا نام بھی غریب داس تھا۔

اُس کی بیوی چند سال پہلے فوت ہو چکی تھی اور اُس کا صرف ایک لڑکا تھا، جس کا نام ستیہ برت تھا۔ جیسا اُس کا نام تھا ویسے ہی اُس کے کام تھے۔ ہر جگہ اور ہر کام میں سچائی کو مدِنظر رکھتا۔ غریب داس کے پاس دیہاتی وضع کا چھوٹا سا مکان تھا۔ مگر وہ بھی خستہ حالت میں۔ نہ تو کوئی کھڑکیاں تھیں اور نہ ہی نیچے فرش تھا۔ اس وجہ سے انھیں برسات کے دنوں میں تو خاص طور پر بڑی ہی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ شاید انھی کے مکان کے لیے کسی نے کہا تھا کہ مینہ اگر کبھی ایک گھنٹہ برسے تو چھت سے پانی کئی گھنٹے برستا رہتا۔ پنڈت غریب داس علم جیوتش میں کچھ جانکاری رکھتا تھا۔ اولڈ فرید آباد اور ارد گرد دیہات کے لوگ اُس کے پاس شبھ مہورت نکلوانے اور جوتش لگوانے آتے رہتے۔ وہ جو نقدی، پھل یا مٹھائی پنڈت جی کی بھینٹ کرتے وہ خوشی سے اُسے قبول کر لیتا خواہ وہ تھوڑا ہی ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک

تو اس طرح سے دُکان خوب چمکتی رہتی اور دوسرے وہ ہر حال میں خوش رہنا چاہتے تھے۔ گھر سے کچھ فاصلے پر ستیہ برت کی چھوٹی سی کریانہ کی دُکان تھی۔ وہ قناعت کا سبق اچھی طرح ہر وقت یاد رکھتے تھے۔ اس لیے کوئی پریشانی نہ تھی۔ وہ اپنے حال میں مست تھے:

وفورِ دول میں مسرت نہیں ہے
مسرور وہ ہے جو قناعت گزیں ہے

اس کے علاوہ وہ اکثر بھگتی تحریک کے علمبردار سنت کبیر داس جی کے اس شعر کو دُہراتے رہتے تھے:

سائیں اتنا دیجیے جس میں کُٹنب سمائے
مَیں بھی بھوکا نہ رہوں سادھو نہ بھوکا جائے

(اے میرے پرماتما! تو مجھے اتنا زر دینے کی کرپا کر جس سے میرے خاندان کا اور میرا پیٹ بھر سکے اور دروازے پر آئے ہوئے سادھو کو بھی کچھ دے سکیں۔ مَیں اور زیادہ نہیں مانگتا) یہ ہے قناعت کا درس جس پر دونوں باپ بیٹا کاربند تھے۔ خیر اسی طرح اپنی وقت کٹی کر رہے تھے۔

عام پبلک میں بالعموم اور برہمن برادری میں بالخصوص غریب داس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کیوں کہ ہر خوشی غمی کے موقعہ پر وہ ان کا شریکِ حال ہوتا تھا۔ آڑے وقت میں اُن کے کام آتا تھا۔ کسی کی غلط رہنمائی نہ کرتا تھا۔ جب ستیہ برت نے جوانی میں قدم رکھا تو باپ کو اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ اُس نے اپنے واقف کاروں اور دوستوں کو اچھا خاندانی شریف ہمسایہ گھرا اور اس خاندان کی پڑھی لکھی گھر کے کام کاج سے واقف سوشیل کنیا کے لیے کہہ رکھا

تھا مگر چھ ماہ گذر جانے پر بھی کوئی اچھا رشتہ ابھی نہیں آیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ہر کام کا وقت مقرر ہے اور پرماتما کو ہمارے کاموں کا فکر ہوتا ہے۔ ایک دن سرائے خواجہ سے پنڈت رام ناتھ اپنی لڑکی کرشنا کے ناطے کی تجویز لے آیا۔ اس نے لڑکی کی اَن گنت صفات کا اچھی طرح سے تذکرہ کیا۔ جو باتیں پنڈت غریب داس چاہتا تھا۔ وہ اس خاندان اور اس لڑکی میں سب پوری تھیں۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ مَن میں آیا کہ ابھی ہاں کر دوں مگر اپنے گھر کی حالت اور اپنی مالی حالت دیکھ کر وہ ابھی رشتے کی منظوری نہیں دے سکتا تھا۔ ویسے بھی صاف دل اور صاف گو انسان تھا وہ رام ناتھ کو کہنے لگا۔

"پنڈت جی! رشتہ کی تجویز کا شکریہ۔ مگر میں صاف طور پر بغیر کچھ چھپائے آپ کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ سرِدست کمزور مالی حالت کی وجہ سے میں لڑکے کی شادی کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ آپکے ساتھ بات چیت ایک سال کے بعد کروں گا۔"

رام ناتھ نے جواب دیا "شریمان جی! آپ تو کسرِ نفسی میں پڑ گئے ہیں۔ کیا میں آپکے حالات نہیں جانتا؟ اگر آپ کی بات کو سچا بھی مان لوں تو اس کا طریقہ بھی بتا دیتا ہوں۔ ہم شادی سال بھر کے بعد ہی کریں گے، اور وہ بھی سادہ۔ ذرا میرا بھی خیال کر لو، میری چار بیٹیاں ہیں۔ کرشنا سب سے بڑی ہے۔ اس کی ذمہ داری سے فارغ ہو جاؤں، تو دوسری لڑکیوں کی شادی کی طرف توجہ دے سکوں گا۔ ایک برہمن کو دوسرے برہمن سے اتنی ہمدردی کی توقع تو رکھنی ہی چاہیے۔

غریب داس کے لیے رام ناتھ کی بات مژدۂ جانفزا سے کم نہ تھی۔ اس نے ہاں کر دی، اور رسم منگنی ایک روپیہ چہرہ شاہی اور گُڑ کے لین دین سے سرانجام پا گئی اور شادی کی تاریخ بھی ایک سال آگے مقرر کر لی۔ اُن دنوں جھٹ منگنی پٹ بیاہ کا رواج نہ تھا۔ واقعی

شرافت و نجابت غریبی پر عاشق ہیں اور شرافت کے اصول غریبوں سے خوب نبھتے ہیں۔

جب شادی کو صرف چار ماہ باقی رہ گئے تو غریب داس کو احساس ہوا کہ مالی حالت میں تو اب تک کوئی خاص سدھار نہیں ہوا۔ برادری میں ناک بھوڑی ہی کٹوانی ہے۔ اس لیے رقم کہیں سے تو لانی ہی پڑے گی۔ کوئی آسمان سے تو نہیں گر پڑے گی، اور کم از کم ایک ہزار روپیہ تو ضروری طور پر مطلوب ہیں۔ اس لیے اس نے اول اپنے واقف کاروں اور دوستوں کے گھروں میں جانے کا معمول بنا لیا۔ دوست کی پہچان تو تنگی اور تکلیف کے وقت ہی ہو سکتی ہے۔ ہر جگہ سے ٹکا سا اور ایک ہی جواب ملتا رہا:

"گر جان طلبی حاضر است
گر زر طلبی مضائقہ در یا است"

(میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں، مگر رقم دینے میں مجھے تامل ہے) دائرۂ احباب سے مایوس ہو کر غریب داس نے اب ساہوکاروں کے چکر کاٹنے شروع کیے۔ ہر ایک ساہوکار نے اس سے یہی مطالبہ کیا کہ "بھائی رقم تو دے دیتے ہیں مگر آپ کا رہائشی مکان گروی رکھ کر۔" انھیں تو اپنے پیسے کی واپسی سب سے مقدم ہے مگر مکان گروی رکھنے سے ساکھ ختم ہو سکتی تھی۔ شادی کا دن نزدیک تر آتا گیا اور ادھر انتظام ابھی نفی کے برابر ہے۔ ستیہ برت اونچ نیچ سب سمجھتا تھا۔ آخر کار غریب داس لڑکے کی مرضی سے پرانے مِتر ہری چند کے پاس سوہنہ گاؤں گیا اور رسمی بات چیت کے بعد اسے اپنی یاترا کا مقصد ظاہر کیا۔ دونوں مدتوں سے ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ ہری چند کو غریب داس کی ایمانداری اور شرافت کا پورا پورا یقین تھا۔ ہنس کر کہنے لگا:

"پنڈت جی! ایک ہزار روپے تو معمولی بات ہے۔ آپ اگر دس ہزار روپے بھی کہیں تو آپ سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس روپے کی واپسی کی کچھ گارنٹی تو ہونی چاہیے۔"

غریب داس نے سوچ کر جواب دیا "پیارے متر! میرے پاس اور تو کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ صرف ایک ہی بات کہہ سکتا ہوں میرا لڑکا اور میری ہونے والی بہو جب تک آپ کی پائی پائی نہ چکا دیں گے اُس وقت تک وہ پتی پتنی کے طور پر نہیں بلکہ بھائی بہن کے طور پر زندگی بسر کریں گے"۔ غریب داس کو اپنے بیٹے پر کتنا بھروسہ تھا کہ اس جگہ میں جو وعدہ کر جاؤں گا میرا سپوت پوری طرح سے اُس کا پالن کرے گا۔ اس جواب سے ہری چند کی پوری تسلی ہو گئی۔ اُس نے تجوری سے ایک ہزار روپے نکال کر پنڈت جی کے سامنے ڈھیر لگا دیے۔ چنانچہ اسٹامپ تحریر کیا گیا وہ لغو شرط بھی حیطۂ تحریر میں لائی گئی۔ اور دونوں نے اپنے اپنے دستخط کر دیے۔

پنڈت غریب داس نے اُس رقم سے پانچ صد روپے اٹھا لیے۔ اپنے تھیلے میں ڈال لیے تو ہری چند کو کہنے لگے "میرے پاس اپنے گھر روپے کو محفوظ رکھنے کا ٹھیک سادھن نہیں ہے۔ اس لیے ابھی صرف پانچ صد ہی لے جاؤں گا۔ باقی رقم میری امانت کے طور پر آپ کے پاس ہی پڑی رہے گی، بوقتِ ضرورت پھر کبھی لے جاؤں گا"۔

غریب داس اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں شومیِ قسمت سے اُسے سخت پیٹ درد کا عارضہ ہوا گھر پہنچتے پہنچتے حالت ابتر ہو گئی۔ بڑی مشکل سے گھر میں اُس روپے کو اپنے لکڑی کے بکس میں رکھ کر قفل تو لگا دیا، مگر ستیہ برت کو بتانا بھول گیا۔ غریب داس کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ ستیہ برت نے بستی سے شہر کے وید حکیم اکٹھے کر لیے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی دانست کے مطابق مجرب نسخے آزمائے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق حالت اور بگڑتی گئی:

مرض موت کا جب اٹھائے گا سر
دوا کر کے ہار ہیں گے کُل چارہ گر

مولانا رومؒ نے بھی شاید اسی موقعہ کے لیے فرمایا تھا: چوں قضا آید۔ طبیب ابلہ شود

(جب موت آتی ہے تو حکیم بھی بیوقوف ہو جاتا ہے) کال کا سماں آچکا تھا۔ آنکھوں میں جہان تاریک و تار ہو گیا۔ فرشتۂ موت نے کوسِ رحلت بجا دیا۔ انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ باپ اپنے بیٹے کی شادی کی حسرت دل میں لیے اس جہان سے اُٹھ گیا۔ بیچارہ ستیہ برت غم میں ڈوبا ہوا زار و قطار رو رہا تھا جیسا کہ دُنیا کا قاعدہ ہے گلی محلے والے کوئی تو اظہارِ افسوس کر رہے تھے اور کوئی تلقینِ صبر کر رہے تھے۔

باقی رسوم ہو چکیں اور آخر رسم پگڑی کا دن آ پہنچا۔ برادری اکٹھی ہوئی۔ گنیش پوجا کے بعد ستیہ برت کو تلک لگایا گیا۔ ستیہ برت کو پہنانے کے لیے ایک نئی پگڑی نکالی گئی۔ سب برادری نے ہاتھ لگانے کے بعد یہ پگڑی اُس کے حوالہ کی۔ ستیہ برت نے کھڑے ہو کر برادری سے یوں خطاب کیا:

"بھائیو اور بزرگو! میرے پتاجی کی موت پر آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو ہمدردی کا اظہار کیا ہے اس کے لیے آپ سب کا شکریہ۔ پگڑی باندھنے سے پہلے میں ایک چھوٹا سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ رسمِ پگڑی کیا معنی رکھتی ہے اور برادری نے پگڑی کو جو ہاتھ لگایا ہے اُس کے کیا معنی ہیں؟"

حاضرین میں سے ایک سفید ریش بزرگ اُٹھ کر یوں گویا ہوا:

"سُن اے عزیز! تو نے ابھی زندگی میں قدم رکھا ہی ہے۔ دُنیا کے اُونچ نیچ تُو کیا جانے؟ یہ ہماری رسمیں بہت پُرانی چلی آتی ہیں۔ کسی کو یاد بھی نہ ہو گا کہ کب سے۔ بزرگوں کی بنائی ہوئی رسموں پر چون و چرا کی ہرگز گنجائش نہیں ہے۔ خاموشی سے ایسا کرتے جاؤ جیسا برادری کہتی ہے۔"

ستیہ برت کی بھلا اس جواب سے تسلی و تشفی کیا ہوتی تھی۔ پھر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا،

"بھائیو اور بزرگو! یہ جتنی رسمیں بنی ہوئی ہیں اُن سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی منطق

ضروری ہے۔ پگڑی کی رسم اس لیے کی جاتی ہے کہ سورگیہ باپ کے بعد اس کا بیٹا اس کی پدوی سنبھالتا ہے۔ اور پگڑی کو برادری اس لیے ہاتھ لگاتی ہے کہ وہ سب مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ ہر شادی غمی میں برابر شامل رہنے کا یقین دلاتے ہیں۔ اب میرا ایک سادہ سوال ہے۔ آپ حاضرین میں سے کون سجن میری دست گیری کا یقین دلا سکتا ہے؟"

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ حامی بھرنے کو ایک شخص بھی تیار نہ ہوا۔ ستیہ برت پھر گویا ہوا:

"افسوس کا مقام ہے کہ اتنی برادری سے ایک مجرد بھی میرا دست گیر بننے کو تیار نہیں ہے۔ میں تو سر سے ننگا ہو گیا ہوں۔ میرا باپ مر گیا ہے۔ میں نے آپ کی ہمدردی اچھی طرح دیکھ لی ہے۔ پرکھ لی ہے۔ ایسی برادری سے میری توقعات کیسے وابستہ ہو سکتی ہیں؟ تقاضائے وقت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مجھے بغیر کسی پر انحصار کے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ میں پگڑی باندھوں یا نہ باندھوں اس سے کسی کو کیا سروکار؟ آپ پگڑی کو کرپا کر کے بکس بند کر دیجیے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔ پرماتما سب کا مالک ہے۔ میں ہاتھ جوڑ کر برادری کو الوداع کہتا ہوں۔"

جوں ہی ستیہ برت نے اپنی بات ختم کی۔ برادری نے اُس کے لب و لہجہ پر اظہار ناپسندیدگی اور نکتہ چینی شروع کر دی۔ کچھ دیر تو وہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ ہر ایک نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ چند دنوں کے بعد ستیہ برت نے گھر کا سامان کھولا۔ اچانک اُس کی نظر باپ کے لکڑی کے بکس میں رکھے ہوئے مبلغات پر جا پڑی۔ ہکا بکا رہ گیا۔ اُسے اپنے پتا جی کی عادت کا اچھی طرح پتہ تھا کہ وہ کبھی جھوٹ نہ بولتے تھے۔ پھر یہ رقم کہاں سے آ گئی۔ اُن کی اپنی ملکیت تو ہو نہیں سکتی۔ کہیں سے شادی کے لیے اُدھار لائے ہوں گے اس لیے اُس نے اب سورگیہ پتا جی کے سب ملنے والوں سے پوچھ تاچھ شروع کی مگر اُن میں سے کسی نے کچھ نہ بتلایا تو اُسے سوہنہ گاؤں کے سیٹھ ہری چند کا خیال آیا۔ چنانچہ وہ سوہنہ اُس کے پاس جا پہنچا۔ اپنے باپ کی موت کا بھی ذکر کیا اور رقم کے بارے

میں سوال بھی پوچھا۔ ہرکی چند نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے مرحوم کی ان گنت صفات کا بھی ذکر کیا اور کہا۔

"پنڈت جی فلاں تاریخ کو یہاں سے مبلغ پانچ صدروپے لے گئے تھے اور ابھی ان کی اتنی ہی رقم یہاں میرے پاس امانت پڑی ہے۔ تمھیں جب ضرورت ہو خوشی سے لے لینا۔"

"چچاجی، مجھے آپ کے اور پتاجی کے گہرے تعلقات کا اچھی طرح پتہ ہے۔ میری شادی کی تاریخ بھی پتاجی مقرر کر آئے تھے۔ میں نے شادی کے التوا کے لیے بہت زور ڈالا مگر میرے سسر نہیں مانتے۔ آپ کرپا کر کے بقایا پانچ صدروپے ابھی دے دیجیے۔"

ساہوکار بڑا سیانا تھا اُس نے دیکھا کہ قرضہ لینے والا تو اس جہان سے کوچ کر گیا۔ اس لیے قانوناً اس کی ذمہ داری تو ختم ہو گئی۔ اُس نے جلدی جلدی پانچ صدروپے نکالے اور رقم کے ساتھ پرونوٹ بھی ستیہ برت کے سامنے دستخط کرنے کے لیے رکھ دیا۔ ستیہ برت نے پرونوٹ میں مندرج وہ شرط جب پڑھی تو بولا۔

"مجھے اس شرط پر تو کاربند رہنا ہی پڑے گا، مگر ذرا سوچیے اس طرح سے میری زندگی تو لٹ گئی۔ اگر سونی اور بے کیف زندگی ہی بسر کرنی ہے تو شادی کا کیا فائدہ؟ لوگ تو شادی خانہ آبادی کہتے ہیں مگر میرے لیے تو شادی کرانا یا نہ کرانا ایک ہی بات ہے۔ اس لیے نہ تو میں کوئی رقم لیتا اور نہ ہی اس پرونوٹ پر دستخط کر کے کوئی ذمہ داری لیتا۔"

ہرکی چند نے سوچا کہ کہیں پہلے دی ہوئی رقم بھی ضائع نہ ہو جائے اس لیے ستیہ برت کو پاس بٹھا کر اُسے خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "بیٹا، تم اور رقم نہیں لینا چاہتے تو مت لو۔ بیشک پہلی رقم بھی کسی دن لے آنا تاکہ بہی کھاتہ میں جمع دکھا کر حساب بے باق کر دوں۔"

وہاں سے ستیہ برت اُٹھ کر آ گیا اور اُس نے اپنے گھر کا راستہ پکڑا۔ لیکن اس کی
حالت بڑی قابلِ رحم تھی۔ دماغ پر یہ خیال لگاتار چھایا ہوا تھا کہ پہلے کی طرح اکیلے کے
اکیلے ہی رہ گئے۔ ہو سکتا ہے کہ عمر بڑی ہو جانے کی وجہ سے کوئی شخص بھی اپنی بیٹی کی شادی
میرے ساتھ کرنا پسند نہ کرے نیز میرے سسرال والے بھی میرے مالی حالات کے متعلق کیا
گمان کرتے ہوں گے۔ اس لیے جوں توں شادی تو تاریخِ مقررہ پر کر لینی ہی موزوں رہے گی
مگر اس کے لیے خرچہ کہاں سے آئے۔ چلو سیٹھ کی خوشامد کر لیتے ہیں۔ رہا سوال رقم کی واپسی
کا۔ زورِ بازو اور ہمت سے سب کچھ ممکن ہے۔ اُلٹے پاؤں سیٹھ کے پاس واپس پہنچا اور
التجا کرنے لگا۔ "چچا جی! اس جہان میں اب آپ ہی میرے بزرگ ہیں۔ آپ کے
سامنے میں تو ایک خورد سال بچہ ہوں۔ آپ کی صلاح کو میں سب سے مقدم سمجھتا ہوں۔
میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ آپ ہی صحیح رہنمائی فرمائیں۔"

"عزیز، پرو نوٹ میں مندرج شرط پر شاید آپ کو کچھ اعتراض تھا۔ میں پوزیشن
صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ آپ لوگ جلد از جلد میری رقم
کی واپسی کی ہر ممکن کوشش کرتے رہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ کیا تم کبھی سوچ بھی سکتے
ہو کہ رقم کی وصولی کے لیے میں تمہارے خلاف عدالتِ مجاز میں نالش کرنے جاؤں گا؟ تم رقم لے جاؤ موج میلہ
مناؤ جب بھی آرام سے واپس کر سکو کر دینا۔ پرو نوٹ میں تم نے ضرور دیکھا ہو گا کہ سود کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ رقم پنڈت جی
کو قدیمی دوستی کی بنا پر دے رہا تھا۔" اس قدر تسلی ملنے پر ستیہ برت نے فوراً پرو نوٹ پر دستخط کر دیے۔ رقم جیب
میں ڈالی اور اولڈ فرید آباد پہنچ گیا۔ اب رقم پاس تھی۔ ستیہ برت نے جلدی جلدی میز
کرسیوں کا آرڈر دے دیا۔ مٹھائیاں اور کھانے پکانے کے لیے حلوائی مقرر کر دیے۔ کپڑے
اور زیور تیار کرائے۔ دعوتی کارڈ بانٹ دیے مگر ہر جگہ کفایت کو پورے دھیان
میں رکھا۔ آخر شادی کی مقررہ تاریخ پر بارات سرائے خواجہ پہنچی۔ رواج کے
مطابق سب شادی کی رسومات سر انجام پا گئیں اور ستیہ برت دلہن لے کر اپنے گھر

پہنچ گیا۔ سیٹھ ہری چند بھی شادی میں شامل رہا اور سب انتظامات دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ رشتہ دار اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے اور اب گھر میں صرف ستیہ برت اور کرشنا ہی باقی رہ گئے۔ بہو نے طرح طرح کے لذیذ کھانے بنائے۔ تھالی پروس کر اپنے پتی دیو کے آگے رکھ دی۔ ستیہ برت بڑے مزے لے لے کر کھانا کھاتا گیا۔ چٹخاروں کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی۔ جیسا کہ کوئی صدیوں کا بھوکا ہو لیکن ساتھ ہی اُس کے چہرے پر قدرے غم اور مایوسی کے آثار بھی نظر آرہے تھے۔ گو کرشنا نے لمبا سا گھونگٹ نکال رکھا تھا مگر وہ پتی کی جملہ حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ کر رہی تھی۔ رات ہوئی تو ستیہ برت کرشنا کو کہنے لگا۔

"پریم پیاری کرشنا، آپنے کھانا بڑا ہی لذیذ بنایا کہ میں کھاتا ہی گیا۔ آپنے محسوس تو نہیں کیا؟ میں تو اب دُکان پر جا رہا ہوں اور رات وہیں سو جاؤں گا۔ اُس آبادی میں اکثر چوری کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ دُکان کی حفاظت اشد ضروری ہے اور ہمارے پاس ہے بھی کیا؟ آپ گھر کے اندر کی کُنڈی لگا لینا اور آرام سے سو جانا۔ میں سویرے سویرے ہی گھر لوٹ آؤں گا۔"

درحقیقت تو ستیہ برت کی آنکھوں کے سامنے پرونوٹ کی وہ شرط تھی مگر بہانہ دُکان کی حفاظت کا تھا۔ بہو بیچاری شرم کے مارے کچھ بھی نہ بول سکی۔ دیوار بن کر کھڑی رہی اور جب تک اسے اپنا پتی نظر آتا رہا ٹکٹکی لگا کر کھڑی دیکھتی ہی رہی۔

بہو اپنی جگہ پر ایک عجیب الجھن میں پھنسی ہوئی تھی۔ جس کا اُسے کوئی حل نظر نہ آرہا تھا۔ رات تارے گن گن کر کاٹی۔ کئی طرح کے سوچ دماغ میں آرہے تھے۔ شاید بارات کی خاطر تواضع ٹھیک نہیں ہوئی۔ شاید پنڈت جی کو جہیز پسند نہیں آیا۔ پھر سوچ آیا کہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو کہیں نہ کہیں سے میرے کان میں بھی بھنک پڑتی۔ آخر اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا کہ شاید کسی پچھلے جنم میں کوئی بڑا گناہ کیا ہوگا۔ جس کی سزا

اب بھگتنی پڑ رہی ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا کہ میرے والدین ایسی شادی کی بجائے مجھے کسی کنوئیں میں دھکیل دیتے۔ اُدھر ستیہ برت بھی عجیب مخمصے میں پھنسا ہوا تھا۔ کوئی راہِ فرار نظر نہ آ رہی تھی۔ رات کو دُکان پر جا کر سونا اور صبح اُٹھ کر گھر آنا یہ اس کا روز کا معمول ہو گیا تھا۔

کرشنا کو جتنا بھی وقت ملتا وہ گھر کی صفائی، چیزوں کو قرینے سے سجا کر رکھنے، پتی دیو کو وقت پر ناشتہ اور کھانا دینے میں لگا دیتی۔ گھر کو اس نے شیشے کی مانند چمکا دیا۔ ستیہ برت دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ مگر کرشنا کی حالت دردِ دروں اور فرقت کی لمبی راتوں کی وجہ سے کچھ دگرگوں رہنے لگی۔ ہر وقت دماغ پر ایک ہی سوال چھایا رہتا کہ آج تو پتی دیو سے ضرور پوچھوں گی کہ اس قدر بے رُخی اور بے اعتنائی کا آخر سبب کیا ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ ہندوستانی عورت تو لجّا کی ساکھشات مورت ہوتی ہے۔ اپنے سوال کو پسِ پشت ڈال کر گھر کے کام کاج میں اس طرح لگ جاتی گویا کوئی بات ہی نہیں ہے۔

آخر صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک دن دل کڑا کر کے لاج و شرم کو خیر باد کہہ کر دل میں فیصلہ کر لیا کہ آج تو میں وجہ پوچھ کر ہی چھوڑوں گی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت کبھی شبنم ہوتی ہے تو کبھی شعلہ۔ آج تک تو وہ شبنم بنی رہی مگر اب وہ شعلے کا روپ دھارن کرنے کے لیے کمربستہ ہے۔ غصہ سے عقل کافور ہو چکی تھی۔ جب ستیہ برت دُکان پر حسبِ معمول جانے کے لیے تیار ہوا تو کرشنا نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ ستیہ برت نے صبح آتے ہی بھانپ لیا تھا کہ آج رانی صاحبہ کے تیور کچھ بدلے ہوئے ہیں۔ کوئی نہ کوئی طوفان آنے والا ہے۔ پر کر کیا سکتا تھا۔ اپنی کمزوری اس پر خوب روشن تھی۔ خاموشی سے آئندہ سین کا انتظار کرنے لگا۔ نہ وہاں ٹھہر سکے نہ بھاگ سکے۔ کرشنا نے اپنے گلے شکوے یوں دینے شروع کیے۔ دروغ برگردنِ راوی۔

"میرے پران ناتھ، آپ شادی کر کے مجھے گھر لائے ہیں، کہیں سے اغوا کر کے

تو نہیں لائے۔ آخر میرے بھی کچھ حقوق ہیں۔ آپ نے مجھے بندی بنا کر جیل میں ڈال رکھا ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی عار نہیں کہ قیدیوں کے ساتھ میری نسبت زیادہ اچھا سلوک ہوتا ہے۔ اُنھیں اپنے سُدھار کا موقع تو دیا جاتا ہے اور یہاں وہ بھی مفقود ہے۔ آپ میری خامی بتائیں اور مجھے اُس خامی کو دُور کرنے کا مناسب موقع تو دیں۔ وواہ کے موقع پر آپنے پرتگیا کی تھی کہ شادی کے بعد تمھیں ہر طرح سے خوش وخرم رکھوں گا اور تمھاری ہر طرح سے خبر گیری کروں گا۔ کہاں گئے آپکے وعدے؟ صرف وہ ہوائی قلعے تھے یا کچھ اور؟ مَیں تو اپنی ڈیوٹی پوری طرح دے رہی ہوں، کیا آپ بھی ازدواجی زندگی کو ٹھیک ڈھنگ سے نبھا رہے ہیں؟ ذرا توجہ سے سنیئے، آپ کا یہ گھرا پڑا اگر میرے لیے محل کے برابر ہے۔ آپ کی دی ہوئی ٹوٹی پھوٹی چارپائی پھولوں کی سیج سے کم نہیں ہے مگر آپ کی موجودگی تو ضروری ہے۔ آپ کو دُکان سے صرف کھانا کھانے کی چھٹی ملتی ہے۔ ادھر مَیں تو ہر وقت تمھارے نام کی مالا پھیرتی رہتی ہوں روز رات کو ویوگ کی اگنی میں جلتی رہتی ہوں اور رو رو کر رات کاٹتی ہوں، کیا اسی کو شادی کہتے ہیں؟ گرہست آشرم سب آشرموں سے اونچا مانا گیا ہے مگر گرہست چلانے کے لیے بھی کچھ سمجھ درکار ہے۔ وواہ کے بعد تو جوڑا آنند کی زندگی بسر کرتا ہے مگر یہاں حالت کچھ اور ہی ہے، بڑا اچھا ہوتا کہ آپ شادی سے پہلے اس مضمون پر کچھ پڑھ لیتے یا کسی سے کچھ سیکھ لیتے۔ عورت مرد کی رفیق اور زندگی کا بہتر حصہ مانی گئی ہے۔ عورت اور مرد ایک گاڑی کے دو پہیئے ہیں جن میں یگانگت از حد ضروری ہے۔ سکھ بھری زندگی کا آدھار ہے، اختیارات و حقوق کی مساوات پر، اگر آپ اسے درست ماننے کو تیار نہیں تو نہ سہی، دوسرے مردوں کی طرح آپ بھی بے شک مجھے پاؤں کی جوتی ہی سمجھیے مگر مَیں آپ کو اپنے لیے ایک دیوتا مان کر پوجا کرتی رہوں گی۔ آپ آفتاب ہیں، مَیں ایک چھوٹا سا ذرہ۔ آپ ایک مضبوط تناور درخت ہیں تو مَیں صرف ایک بیل کی مانند ہوں جسے درخت کا سہارا چاہیے۔ اگر وہ سہارا نہ ملا تو بیل سوکھ جائے گی۔ مَیں اتنے دن دیکھتی رہی آپنے میری ایک نہ سنی۔ میرا

آخری وقت قریب آ رہا ہے۔ آپنے ایک دلِ پُر آرزو کا خون کر دیا۔ اور میری شرمیلی نوخیز آرزوئیں آپنے پامال کر دیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میری حالت اس شخص کی مانند ہے جو دریا میں رہتے ہوئے بھی پیاسا ہو، بتائیے دل کا سکون ہو تو کیوں کر ہو:

بغیر یار کے سب گُل خار ہیں آنکھوں میں
کھٹک رہی ہے چمن کی بہار آنکھوں میں

میرے پوجیہ سوامی جی، آپ بے شک مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہیں مگر میں کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ آپ میرا وہ حق چھین رہے ہیں جو ازدواجی زندگی کی سب سے بڑی دولت ہے۔ آپنے شاید سُنا نہیں کہ بے گناہ کا دل دُکھانے سے عرش بھی ہل جاتا ہے۔ میری روح کا کرب تم اب تو محسوس نہیں کر رہے ہو مگر تمہاری یہ لغزشیں کسی وقت تمہارے مستقبل کو تباہ کرنے کا موجب بن جائیں گی۔ تم اپنے مستقبل کی گردن پر چھری پھیر رہے ہو گے اور طعنے سُن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ گلی محلے کی عورتیں آخر سب کچھ دیکھتی رہتی ہیں، عورت کا حوصلہ، غرور اور عزت شوہر کی ذات سے ہی وابستہ ہوتی ہے۔ میرے گلے تو جو بلا پڑی ہے وہ ساری دُنیا سے انوکھی ہے:

ہے وہ بلا جو سہی نہ جائے
بپتا ہے جو کہی نہ جائے

میرے جیون ساتھی! آپ اگر کسی وجہ سے مجھے اپنے گھر نہیں رکھنا چاہتے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر اس طرح تڑپا تڑپا کر کُند چھری سے نہ ماریے۔ ہم سب نے ایک دن پرماتما کو منہ دکھانا ہے۔ اپنے ہاتھ سے مجھے زہر کا پیالہ دے دیجیے میں اُس کو امرت سمجھ کر پی جاؤں گی۔ ہرگز نہیں کڑھوں گی۔ آپ کو تو ابدی نجات مل جائے گی۔ اگر آپ کو یہ بھی

منظور نہیں تو میں آتم ہتیا کر لوں گی۔ کل جب دکان سے آؤ گے تو مجھے مردہ ہی پاؤ گے۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ کوئی بھی شریف آدمی اپنی لڑکی تمہیں دینا پسند نہیں کرے گا اور تم عمر بھر رنڈوے ہی رہ جاؤ گے۔"

کرشنا نے بے ترتیب کھلے بال چھوڑ رکھے تھے۔ ساتھ ساتھ گریہ وزاری بھی کرتی رہی۔ رونا تو عورت کا آخری ہتھیار ہوتا ہے۔ بیچارے ستیہ برت کی حالت بڑی قابلِ رحم تھی۔ اتنی باتیں سننی پڑیں مگر خوب سمجھ رہا تھا کہ کرشنا کی باتوں میں کافی حد تک سچائی ہے۔ اس کا دل پسیج گیا۔ شادی بھی تو ابھی ہوئی تھی۔ سوچنے لگا کہ کرشنا جو آج اس قدر آگ بھبوکا ہو رہی ہے کہیں آتم ہتیا ہی نہ کر لے۔ الٹے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ مصلحتِ وقت یہی ہے کہ وہ راز جسے آج تک راز ہی رکھا اب اس پر افشا کر دیا جائے۔ اپنے پاس بٹھا کر خوشامدانہ لہجے میں یوں گویا ہوا:

"میری پیاری کرشنا، آپ نے جو کچھ کہا وہ سب درست ہے۔ آپ نے گھر کے سنبھالتے ہیں، میری سیوا میں واقعی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ میں آپ کا شکر گذار رہوں۔ میں تمہاری طرف سے جو لاپرواہی کر تا رہا ہوں اس وجہ سے سخت نادم ہوں میرے پاس اس لاپرواہی کا کوئی جواب نہیں ہے۔ آج آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں کہ شادی کے بعد میرے بھی کچھ فرائض ہیں۔ اگر تم چند روز پہلے اور تھوڑی سی نرم زبان سے یہی باتیں کہہ دیتی تو وہ زیادہ اچھا ہوتا۔ خیر آج آپکے اصرار پر میں اپنا ایک بھید آپ کو بتلانا چاہتا ہوں۔ سنیئے میرے سورگیہ پتاجی نے ہماری شادی کے اخراجات کے لیے کہیں سے مبلغ ایک ہزار روپیہ قرضہ لیا تھا۔ ساہوکار کو جو پرونوٹ لکھ کر دیا گیا اس میں ایک لغو شرط تھی کہ جب تک پورا قرضہ اتر نہ جائے گا ہم بطور بھائی بہن رہیں گے نہ کہ پتی اور پتنی کے طور پر۔ ہمارے پتاجی ہمارے لیے قرضہ چھوڑ گئے۔ یہ تو برا ہوا مگر انھوں نے تو قرضہ لیتے وقت اپنے بیٹے کی خیرخواہی

مدِ نظر رکھی ہوئی تھی اور اُن کی اچانک موت نہ ہوتی تو یہ قرضہ آج تک ادا ہو چکا ہوتا۔ مَیں نے بلا کم و کاست ساری کہانی تمھیں سُنا دی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اگر میں باپ کی لاج اپنے نام کی لاج کو مدِ نظر رکھ کر دُکان پر جا کر سوتا رہا تو میں نے کیا گناہ کیا؟ میرا دل بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہے مَیں نے اپنے آپ پر کتنا کنٹرول کیا ہوگا؟"

کرشنا سُن کر سہم گئی۔ گرمی کا لہجہ یک لخت نرمی کے لہجہ میں بدل گیا۔ لگی ہاتھ پاؤں جوڑنے اور معافی مانگنے، کہ معاملہ مخواہ اُتنا طول کھینچ گیا۔ پتی کو کہنے لگی "پربیہ پران ناتھ جی! مَیں آپ کی سچی مترّ ہوں۔ آپ بدستور اپنی دُکان پر جائیے۔ پرماتما سب کی مشکلات حل کرنے والا ہے: کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما (ہمارا پروردگار ہمارے کام کی فکر میں ہے۔) اس مشکل کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ آپ بھی ذرا سوچیے، اور مَیں بھی آج سوچوں گی۔ تعاون سے کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔" کرشنا کی پلکوں پر جو آنسو بہہ رہے تھے وہ اُس نے دوپٹے سے پُونچھ ڈالے۔ ستیہ برت ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسائے آنکھیں موند کر سب کچھ سنتا رہا اور غمگینی و اداسی کی حالت میں ہی اپنی دُکان پر چلا گیا۔

اگلی صبح ستیہ برت گھر آیا۔ اُسے تو قرض کی ادائیگی کی کوئی معقول سبیل نہ سوجھی مگر کرشنا زیادہ ہوشیار اور زیادہ سمجھ دار تھی۔ اس نے پلان بنا لیا تھا۔ کہنے لگی۔ "میری تجویز ذرا سنیے۔ آپ اُسی سیٹھ کے پاس جا کر کل ہی ایک ہزار روپیہ مزید قرض لے آئیے اُسے بتلا دینا کہ ہم اب ایک اچھا کاروبار کریں گے اور جلد ہی قرضہ چکا دیں گے۔ ہم نے آزادانہ طور پر خوش و خرم زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس میں آپ کی سہایتا اور آشیرواد چاہتے ہیں۔ ہاں تو ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں، میری تجویز منہ کا نوالہ نہیں ہے مگر اس کا سرے چڑھنا مشکل بھی نہیں ہے کیوں کہ اب ہم دونوں

کی قسمت مل کر کام کرے گی۔ محنت و تدبیر سے ہماری غربت اور ناداری لازمی طور پر ٹل جائے گی۔ ہمارا پتی اور پتنی کا رشتہ بدل کر روحانی رشتہ بن چکا ہے۔ کوئی بھی دُنیا کی مشکل ایسی نہیں جس کا حل نہ نکل سکتا ہو۔ اسکیم آپ کو رقم لانے پر ہی بتاؤں گی۔"

ستیہ برت پر کرشنا کی ذہانت کا سکّہ بیٹھ چکا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کرشنا اپنی عمر سے کئی گُنا زیادہ دماغ رکھتی ہے۔ اگلے ہی دن ہری چند کے پاس جا پہنچا اور اسے اپنی ساری گھریلو بات کہہ سُنائی ہری چند نے یہ دیکھ کر کہ لڑکا وعدے کا کتنا پکّا ہے اور قرض اتارنے کے لیے واقعی جدّ و جہد کر رہا ہے، اُسے ایک ہزار روپے اور دے دیے اور پُرانے تمسک پر دستخط کرا لیے۔ وہ خوشی خوشی جلد واپس گھر پہنچا۔ روپوں کی ڈھیری کرشنا کے آگے لگا کر بڑی بے تابی سے پروگرام پوچھنے لگا۔ کرشنا کے چہرے پر آج بشاشت تھی۔ صابرانہ انداز سے کہنے لگی "میرے راجہ! سنیے آج سے آپ کا نام "بڑا بھیّا" ہو گا اور میرا نام "چھوٹا بھیّا" ہو گا۔ ہم ایک دوسرے کو انھی ناموں سے مخاطب کیا کریں گے۔ اب آپ اعلیٰ نسل کے دو گھوڑے خریدیے۔ اُن کا ساز و سامان بھی اعلیٰ ہونا چاہیے، جیسا کہ راجکماروں کے پاس ہوتا ہے۔ دو مردانہ شاہانہ پوشاکیں بنوائیں اور گھوڑوں کے لیے پورے ایک ماہ خوراک کا سامان اکٹھا کریں۔ ایک ٹین دیسی گھی بھی ان گھوڑوں کی خوراک کا جزو بنے گا۔ چُستی سے اس کام میں جٹ جاؤ، ہاں تو سارا خرچ بڑی کفایت شعاری سے کرنا، جو رقم بچ جائے میرے حوالے کر دینا۔"

ستیہ برت اپنے ایک پُرانے واقف کار کے پاس گیا۔ وہ راجہ بلم گڑھ کے شاہی اصطبل میں کافی دیر گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا رہا تھا۔ اس کی امداد سے تھوڑے ہی دنوں میں گھوڑے و ساز و سامان وغیرہ سب کچھ خرید کر لیا۔ ستیہ برت اور کرشنا نے مل کر گھوڑوں کی سیوا شروع کر دی۔ دانے میں مناسب مقدار میں گھی بھی ملایا

جاتا اور دونوں نے صبح، شام دو دو گھنٹے روزانہ گھوڑ سواری کی مشق شروع کر دی۔
کرشنا اکثر گھوڑوں کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیتی اور ان کی پیٹھ سہلانے لگتی۔ گھوڑے ان سے بڑے گھُل مِل گئے۔ اپنے مالکوں کو خوب پہچاننے لگے۔ "بڑا بھیّا" اور "چھوٹا بھیّا" بھی ماہر شہسوار بن گئے۔ چھوٹا بھیّا کہنے لگا۔ "دیکھیے صاحب! سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ میرا دل پوری گواہی دے رہا ہے کہ وہ سفر جس پر کل ہم روانہ ہوں گے۔ ہمارے لیے انتہائی فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اور اس طرح ہمارے گذارے کی معقول سبیل نکل آئے گی۔ ایسے موقعے روز روز نہیں آتے۔ ایسے لمحے شاذو نادر ہی آتے ہیں اور وہ ساری زندگی کا عنوان بدل دیتے ہیں۔" کرشنا اپنے مَن ہی مَن میں اپنے رنجش آمیز سخن کی وجہ سے شرمندہ ہو رہی تھی۔ اب دونوں کا دماغی توازن اصل حالت پر آچکا تھا۔

اگلے دن علی الصباح بڑا بھیّا اور چھوٹا بھیّا مردانہ لباس پہن کر اصطبل گئے۔ گھوڑوں پر زین کسا اور پرماتما کا نام لے کر اُن پر سوار ہو کر عازمِ سفر ہوئے۔ سفر کے لیے کوئی معیّن رستہ نہ تھا۔ نہ کوئی معیّن منزل تھی۔ جدھر کو گھوڑوں نے منہ کر لیا اُدھر کو ہی چل نکلے۔ گھوڑے باد رفتار تھے۔ وہ اپنے مالک کے اشارے کو خوب سمجھتے تھے۔ ہنٹر مارنے کی کبھی ضرورت نہ پڑتی۔ تھوڑی ہی دیر میں گھوڑوں نے کافی سفر کر لیا، اور ایک بڑی سڑک پر جا پہنچے۔ اتّفاق کی بات ہے کہ سڑک کے سامنے سے ریاست کے راجہ کی سواری نکلی۔ ایک جمِ غفیر ساتھ تھا۔ راجہ شکار کھیلنے کے لیے جنگلوں کی طرف جا رہا تھا۔ راجہ نے دیکھا کہ دو خوب صورت نوجوان دو خوب صورت گھوڑوں پر سوار جا رہے ہیں۔ گھوڑے اصیل نسل کے ہیں جن کا سینہ شیر جیسا ہے اور کمر چیتے جیسی، گویا کہ وفاداری اور محبت کا عمدہ نمونہ ہیں۔ راجہ کا من للچا گیا۔ فوراً منتری کو ان کے پاس بھیجا کہ ابھی جا کر سارا احوال پتہ کر کے آؤ کہ یہ راجکمار کس ریاست کے ہیں؟ کدھر جا رہے ہیں اور ان کا ادھر گھومنے کا مقصد کیا ہے؟ منتری اُن کے پاس پہنچا۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد اس نے

سوالات پوچھے۔ بڑا بھیا کہنے لگا "مہاراج! ہماری طرف سے راجہ صاحب اور آپ کو ہمارا پرنام ہو۔ ہم جوہری بچے ہیں۔ ہمارا کام ایک ریاست سے دوسری ریاست ہیرے جواہرات لے جانا اور بیچنا ہے۔"

منتری نے راجہ صاحب کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو راجہ نے منتری کو دوبارہ ان کے پاس بھیجا کہ ان سے پوچھو کہ ایک ایک کی ماہواری آمدن کیا ہے؟ وزیر نے تعمیلِ حکم کی۔ استفسار پر اب چھوٹا بھیا بولا "مہاراج! ہماری ایک ایک کی ماہواری آمدن ایک ہزار روپے سے کسی صورت کم نہیں ہے، اس طرح سے تقریباً دو ہزار روپے بن جاتے ہیں اور ہمارا اچھا گذارہ ہو جاتا ہے۔"

راجہ کے کانوں تک یہ خبر بھی جا پہنچی۔ وہ دونوں شہسوار اور دونوں گھوڑے راجہ کے لیے کشش کا باعث بنے ہوئے تھے۔ اس لیے راجہ نے حکم صادر فرمایا کہ "منتری! ابھی جاؤ، ان شہسواروں کو ایک ایک ہزار روپے ماہوار پر تیار کر کے ساتھ لے آؤ۔ ان میں سے ایک شہسوار ہمارے ہاتھی کی دائیں طرف اور دوسرا ہاتھی کی بائیں طرف اسی طرح اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہمارے جلوس کے ہمرکاب رہیں گے۔ اس سے ہمارے جلوس کی زینت دوبالا ہو جائے گی۔"

ناظرین! راجاؤں کو بھلا ان چھوٹے چھوٹے اخراجات کا خیال کیسے آسکتا ہے۔ انھیں تو نمود و نمائش سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ منتری ان دونوں کو جا کر لے آیا۔ انھوں نے دستور کے مطابق بڑی عزت سے راجہ کو پرنام کیا۔ راجہ نے اُنھیں شاہی ملازموں کے زمرہ میں شامل کر لیا۔ چھوٹا بھیا بڑے بھیا کو اشارہ سے کہنے لگا "دیکھا صاحب! آخر پرماتما نے ہماری سن لی۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ جو آدمی ہمت کرتا ہے، پرماتما بھی اس کی مدد کرتا ہے۔" اُس دن سے جو بھی ڈیوٹی ان کی لگائی جاتی وہ ہمیشہ بڑی لگن — نیک نیتی اور ایمانداری سے بھگتاتے۔ وہ ڈیوٹی کو پرماتما کی بندگی کا درجہ دیتے تھے۔

وقت کا تیز رو دریا بہتا گیا۔ بڑا بھیا اور چھوٹا بھیا ہر دو اپنے مخصوص اندازِ تکلم اور معصوم تبسم سے آہستہ آہستہ مہاراج کی نظروں میں خوب چڑھ گئے۔ ان کا نام اب مہاراج کے خاص ملازموں کی فہرست میں آ گیا۔ مہاراج کو ان پر کلی اعتماد تھا۔ برسات کا موسم آیا تو راجہ بہادر نے منتری کو حکم دیا "منتری جی! اس دفعہ مابدولت موسمِ برسات شاہی باغ کے نزدیک ہی گزارنا چاہتے ہیں۔ اس لیے شاہی خیمے وہاں وقت پر ہی لگوا دیے جائیں۔ خیموں کے باہر روز رات کو نو بجے سے بارہ بجے تک بڑے بھیا کی اور اس کے بعد بارہ بجے سے صبح چار بجے تک چھوٹے بھیا کی پہرے کی ڈیوٹی ہوا کرے گی۔"

تعمیلِ حکم ہو گئی اور راجہ صاحب بمعہ عیال و اطفال ان خیموں میں پہنچ گئے۔ ایک دن رات کو بارہ بجے جب بڑا بھیا ڈیوٹی سے فارغ ہو کر واپس گھر پہنچا تو اس نے چھوٹے بھیا کو ڈیوٹی پر بھیجا۔ اُسے چوکس رہنے کی بھی پوری ہدایت کر دی۔ جب رات کچھ ڈھل چکی تو یک لخت گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں جو مَن کو بڑا اُبھلانے والی تھیں۔ اُدھر ایک کونہ سے بجلی کوندی۔ بادل اُبھرا اور چھما چھم برسنے لگا۔ وہ سہانی چاندنی رات ایک سیاہ اور تاریک رات میں بدل گئی۔ اتنی دیر میں رات کے گہرے سناٹے میں ایک درخت سے پپیہا کی آواز چھوٹے بھیا کے کان میں آئی۔ "پی ہو، پی ہو" پپیہا کا بولنا چھوٹے بھیا پر جادو کا اثر کر گیا۔ اس کی نسوانی حس جاگ اٹھی۔ برہا کی اگنی نے تنگ کرنا شروع کیا۔ اس پر عین جوانی کا عالم تھا، مگر ازدواجی زندگی کی خوشیوں سے سراسر محروم۔ شومیٔ قسمت سے بے ساختہ یہ لفظ اُس کے منہ سے نکل گئے:

پپیہا پی پی کیا کرے، پیا بنے ہیں بیر
جا پپیہا گھر اپنے، مت کر مَن دل گیر

(اے پپیہا، تو پا پی کی آوازیں کیوں نکال رہا ہے، میرا مالک تو میرا بھائی بنا ہوا ہے، اس لیے

یہی بہتر ہوگا کہ تو اپنے گھر چلے جا اور میرا من نہ دُکھا۔ چھوٹے بھیا نے یہ الفاظ جو پیپہا کو مخاطب کرکے کہے تھے وہ راجہ صاحب کے کانوں میں بھی پہنچ گئے۔ انھوں نے آواز دے کر پوچھا۔ "پہرہ پر اس وقت کون جوان ہے؟" چھوٹے بھیا نے جھٹ جواب دیا۔ "مہاراج! چھوٹا بھیا ڈیوڑی پر چوکس ہے۔" راجہ نے پھر سوال کیا۔ "یہ آواز کہاں سے آئی تھی؟" "مہاراج بہادر! آواز تو کوئی نہیں تھی۔ آپ آرام سے سو جائیے، میں ہر طرح کی خبرداری کرتا رہوں گا۔" گھنٹہ دو گھنٹہ گذر گئے۔ پیپہا نے پھر وہی بطریق سابق آواز نکالی۔ چھوٹے بھیا نے بھی وہی پرانا شعر دُہرایا۔ راجہ صاحب نے جب سوال کیا کہ "ڈیوڑی پر کون؟" تو چھوٹا بھیا کہنے لگا۔ "مہاراج جی! چھوٹا بھیا۔" راجہ صاحب کی نیند میں اس طرح جب خلل آتا رہا تو وہ کچھ ناراض سے ہو گئے کہ آج تک تو پہلے کبھی ایسا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ آج یہ کیا چکر ہے۔ ایک دفعہ آواز سننے پر اُنھیں صرف شک ہی ہوا تھا۔ اب شک یقین میں تبدیل ہو چکا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ سنتری کو حکم دیا۔ "اس نابکار ناہنجار چھوٹے بھیا کو گرفتار کر لو۔ کل صبح اسے دربارِ عام میں پیش کرنا اور اس کی جگہ پر کوئی اور پہریدار تعینات کر دو۔" حکم کی فوراً تعمیل ہو گئی اور اگلے دن چھوٹے بھیا کو رسّوں میں جکڑا ہوا دربارِ عام میں پیش کیا گیا۔ بُری حالت تھی۔ راجہ کو چھوٹے بھیا کی آواز سے پہلے ہی کچھ نسوانیت کے عنصر کی بُو آ چکی تھی۔ اب اسے بڑے غور سے سر سے پیر تک دیکھا۔ دل میں کئی طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ چھوٹا بھیا ہیبت شاہی سے کانپ رہا تھا۔ آخر مہاراج کہنے لگے۔ "اے پہریدار! سچ سچ بتا۔ رات کو ایک نہیں دو بار میرے کانوں میں کچھ آواز آتی رہی۔ یہ آواز تیری تھی اور اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس کا کارن کیا تھا، تم کس کو جواب دے رہے تھے اور کیا جواب دے رہے تھے؟ ہم نے بھی تم سے دو بار پوچھنے کی کوشش کی تو تم نے ٹالنے کی ہی ٹھانی۔ تمھیں اتنی جرأت کیسے ہوئی؟ اگر سچ سچ بتا دو گے تو ما بدولت تمھیں معافی دے سکتے ہیں اور اگر جھوٹ

بولو گے تو سخت سزا پاؤ گے "۔ چھوٹا بھیا سر جھکائے سامنے کھڑا تھا گویا کہ اپنے گناہ کا اعتراف کر رہا ہے۔ بڑی نمرتا سے کہنے لگا۔ "مہاراج ادھیراج! ہمیشہ سلامت رہو۔ آپ کے نمک حلال نوکر ہمیشہ آپ کے فیض سے فائدہ اُٹھاتے رہیں۔ مَیں سارا بھید آنحضور پُر نور کے سامنے کھول دینا چاہتا ہوں۔ مگر اس کے لیے علیحدگی درکار ہے۔ منظوری بخشی جاوے"۔ راجہ نے حاضرین کو حکم دیا "تخلیہ" سب شخص آگے پیچھے ہو گئے تو خلوت میں کہنے لگا۔ "راجاؤں کے سرتاج! مَیں ایک نوجوان ناری ہوں۔ میرا نام کرشنا ہے اور میرے ساتھی کا نام پنڈت ستیہ برت ہے، وہ میرا پتی ہے۔ اب میں آپ کے سامنے اس کا پس منظر پیش کرنا چاہتی ہوں۔ کافی وقت گذرا۔ ہماری دونوں کی منگنی ہوئی۔ جب شادی کی تاریخ نزدیک آگئی تو میرے سورگیہ سُسر شری غریب داس قریہ آباد نواسی نے ایک ساہوکار کے آگے جھولی پھیلائی اور مبلغ ایک ہزار روپے بطور قرضہ شادی کے اخراجات کے لیے کیوں کہ اس کے پاس بڑی مالی تنگی تھی۔ ساہوکار نے سُود تو نہ لیا، مگر پرونوٹ میں ایک ایسی کچر شرط میرے سُسر سے لکھوالی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ شرط کا مفہوم یہ تھا کہ جب تک قرضہ کی پُوری بے باقی نہیں ہو جائے گی اُس وقت تک ستیہ برت اور کرشنا بطور بھائی بہن رہیں گے نہ کہ بطور پتی پتنی۔ میرے سُسر پنڈت جی تو پرلوک سدھار گئے اور ہمارے لیے ایک عذاب چھوڑ گئے۔ ہم نے کتنا ہی وقت اس شرط کی تحریر کے مطابق کاٹا۔ بڑوں کا لکھا ہوا ہمارے لیے ایک خدائی حکم تھا اور پھر ستیہ برت کو اپنے نام کی لاج بھی رکھنی تھی۔ یہ ہمارے دل ہی جانتے ہیں کہ کس طرح زندگی کے دن گزارے اور اپنا وقت رو دھو کر لڑ جھگڑ کر پورا کیا۔ ایسے دن تو پرماتما دشمن کو بھی نہ دکھلائے مگر ہم ہمت نہیں ہارے۔ تدابیر سوچتے رہے کہ قرضہ سے کس طرح چھٹکارا حاصل کر کے آزادانہ خوش و خرم شادی شدہ زندگی بسر کریں اور دو نوجوان روحوں پر اس وقت جو ظلم ہو رہا ہے اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ آخر کار ہم نے سوداگری کی ٹھانی۔ اُسی ساہوکار سے مزید قرضہ لیا۔ یہ

گھوڑے اور یہ ساز و سامان خرید اکہ سوداگری سے سارا قرضہ ادا کر دیں گے۔ نام بھی اسی لیے بدلے۔ میں نے اپنا نام چھوٹا بھیّا اور پنڈت ستیہ برت نے اپنا نام بڑا بھیّا رکھا کیوں کہ ہم اپنے آپ کو بپتی بپتی تو ظاہر کر ہی نہیں سکتے تھے گھر بار بھی چھوڑا۔ یہ ہماری بڑی خوش قسمتی تھی کہ ہمیں آنحضور کے درشن ہو گئے۔ راجہ کو تو لوگ پرماتما کا سایہ کہتے ہیں وہ اپنی رعایا کا مائی باپ ہوتا ہے۔ آپ نے کمال مہربانی سے ہمیں اپنے بے شمار نوکروں کے زُمرہ میں شامل کر لیا اور ہمیں اپنی وفاداری اور نیک نیتی کا ثبوت بہم پہنچانے کا ایک موقع دیا نہیں تو ہم دردر کی ٹھوکریں کھاتے۔ آخر میں میں آپ سے معافی چاہتی ہوں کیوں کہ پرماتما کے زیادہ نزدیک وہی شخص ہو سکتا ہے جو دوسروں کی خطائیں بخشتا ہے۔ دل میں اگر کوئی رنجش ہو یا کدورت ہو تو کرپا کر کے اب اسے دُور کر دیجیے۔ کیوں کہ ہم نے جو کچھ صحیح یا غلط کیا اپنی خوشی سے نہیں کیا بلکہ حالات کی مجبوری سے کیا۔" یہ کہتے کہتے زمین خدمت کو بوسہ دیا۔ راجہ کو یہ حالات سن کر اچنبھا ہُوا۔ اور ان سے قدرتی طور پر ہمدردی پیدا ہو گئی۔ راجہ کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ لوگ بڑے ایماندار اور وعدے کے پکے ہیں تاہم چھوٹے بھیّا کے بیان کی تصدیق کرنی ضروری سمجھی اور بڑے بھیّا کو بھی علٰحدگی میں بلا کر اس سے جانکاری لی۔ دونوں کے بیانات بالکل ایک جیسے ہی تھے، کوئی تضاد نہ تھا، اس لیے خزانچی کو وہیں بلا کر حکم دیا: "مابدولت بڑے بھیّا اور چھوٹے بھیّا ہر دو کی دیانت داری اور صاف گوئی سے بہت خوش ہوئے ہیں۔ از راہِ خوشنودی حکم دیتے ہیں کہ انھیں مبلغ دو ہزار روپے نقد سرکاری خزانہ سے ابھی ادا کر دیے جائیں تاکہ یہ لوگ اپنا قرض اُتار سکیں۔ مزید ہم نے ان کا گزارہ الاؤنس تاحینِ حیات مبلغ ایک ہزار مقرر کر دیا ہے۔ اس الاؤنس کی ادائیگی ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ہونی چاہیے۔" ستیہ برت اور کرشنا دونوں مہاراج کے قدموں پر گر پڑے اور ان کا دلی شکریہ ادا کیا۔ خزانچی نے انھیں دو ہزار روپے اُسی وقت ادا کر دیے۔ انھوں نے اجازت لی اور دربار سے ہشاش بشاش باہر نکلے خوشی

کے آنسو چھلک رہے تھے۔ سب امیر وزیران کی ایمانداری اور راجہ بہادر کی فیاضی اور دریادلی پر عش عش کر رہے تھے۔ ستیہ برت اور کرشنا خوشی خوشی واپس اپنے گھر پہنچے۔ اگلے ہی دن صبح کے وقت روانہ ہو کر سوہنہ جا پہنچے۔ رقم کی ادائیگی کر کے پرونوٹ واپس لیا اور اسے ضائع کر دیا۔ اب وہ ایک خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے۔ پرماتما نے بچے بھی دے دیے۔ دونوں نے مل کر دکان کا کام بڑھایا۔ ان کی زندگی دوسروں کے لیے باعثِ رشک بن گئی۔ سب رشتہ دار اور ہمسایہ گان اُن کی ہمّت کی داد دینے پر مجبور تھے۔

○
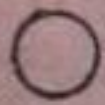
سچائی کی برکت

کچھ عرصہ گذرا موجودہ ہماچل پردیش کے ضلع ناہن کے ایک گاؤں رنجیت پور میں ایک مشہور و معروف چور مسمی اچھرو رہا کرتا تھا۔ ویسے تو وہ ہر فن مولا تھا مگر چوری کرنے کے معاملہ میں وہ اپنی مثال آپ ہی تھا اپنے فن میں یکتا تھا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر چوری کرتا تھا پولیس اس کا پیچھا کرتی رہتی۔ مگر وہ کبھی ان کے نرغے میں نہ آیا۔ چوری کے علاوہ اور بھی کئی برائیاں اُس میں موجود تھیں۔ اُس کی آمدنی کا بیشتر حصہ شراب نوشی اور اسی طرح کی کئی نشیلی چیزوں کے استعمال پر صرف ہو جاتا۔ کبھی کچھ بچ جاتا تو وہ جوئے کی نذر ہو جاتا۔ حرام کا مال بڑی بے دردی سے خرچ ہوتا ہے۔ یہ دُنیا کا قاعدہ ہی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اچھرو نے اپنے گھر سے دُور دوسرے ضلع کی حدود میں ایک ساہوکار مسمی رام دھن کے گھر رات کو چھت پھاڑ کر چوری کی۔ رام دھن کے بارے میں اسے کہیں سے پتہ چل گیا تھا کہ وہ بمعہ عیال و اطفال چند دن سے باہر گیا ہوا ہے اور یہ بھی پتہ تھا کہ ساہوکار نے اس شخص نے بے شمار مال و زر پیدا کیا ہے۔ عرصہ سے موقعہ کی تاک میں تھا۔ اپنے ضلع میں چوری کرنا وہ معیوب سمجھتا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور وہ سونے کے زیورات اور چاندی لے کر ایک ایسے سنار کے پاس پہنچا جس کے ساتھ پُرانی ملی بھگت تھی۔ کوئی کپڑا یا بستر نہیں اٹھایا کیوں کہ ان چیزوں کی وجہ سے چور کی گرفتاری میں اکثر مدد ملتی ہے۔ سُنار نے سونے کے زیورات

کو بھٹی میں ڈال کر اچھی طرح پگھلا دیا۔ کچھ کھوٹ ملا دیا اور اس سودے میں خوب ہاتھ رنگے۔ بنشن مشہور ہے "چوروں کے کپڑے اور لاٹھیوں کے گز"۔ اب ہر روز دن اور رات جوا خانہ جانا اس کا معمول ہو گیا۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ ساری کمائی تھوڑے ہی دن میں برباد ہو گئی۔ ایک دن صبح اچھرو اٹھا۔ بھوک پیاس نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ صرف ایک ہی روپیہ نکلا۔ حلوائی سے اس روپے کے کھوئے کے پیڑے لیے۔ آج کہیں اسے خیال آ گیا کہ پہلے تو کبھی اشنان کم ہی کیا ہے۔ لیکن آج یہ پیڑے اشنان کر کے ہی کھاؤں گا۔ ندی کا رُخ کیا۔ اتفاق سے راستہ میں ایک بزرگ سادھو کے درشن ہو گئے جو ندی سے اشنان کر کے اور ایشور کے بھجن سے فارغ ہو کر شہر کی طرف بھوجن کے لیے آ رہے تھے۔ وہ راستے میں آتے جاتے سب لوگوں سے بھوجن کے لیے پرارتھنا کر رہے تھے لیکن لوگ سُنی اَن سُنی کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ اچھرو کا دل سادھو کی پرارتھنا سے اس حد تک پسیج گیا کہ اس نے اپنی بھوک پیاس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ لفافہ جس میں کھوئے کے پیڑے تھے جوں کا تُوں سادھو مہاراج کے حوالے کر دیا۔ ناظرین! سوچنے کی بات ہے کہ کبھی کبھی بُرے کام کرنے والے بھی اچھائی کے کاموں میں یُوں حصہ لیتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اچھرو ندی سے نہا دھو کر ابھی فارغ ہوا ہی تھا کہ اُس کا ایک پُرانا ہم جماعت ہیرا لال اُسے ندی پر ہی مل گیا۔ مدتوں کے بعد دو دوست ملے تھے۔ ہیرا لال اُسے بضد اپنے گھر لے گیا۔ دونوں نے مل کر کھانا کھایا خوب لُطف اُٹھایا۔ برسبیلِ تذکرہ ہیرا لال نے اچھرو کو بتلایا کہ یہاں ہمارے مندر میں آج شام کو ایک خدا رسیدہ اور مشہور مہاتما کا ست سنگ ہے، اور اُن کا قیام صرف آج کے دن کا ہی ہے۔ اچھرو کے دل میں بھی سنت مہاتما کے درشنوں اور ان کا ست سنگ سُننے کی زبردست اُمنگ پیدا ہوئی۔ جب ست سنگ ختم ہو گیا اور لوگ آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو اچھرو نے یہ دیکھ کر کہ اب مہاتما جی بالکل اکیلے رہ گئے ہیں تو وہ اُن کے قدموں میں جا کر بیٹھ گیا۔ بڑی عاجزی سے سر جھکایا اور خاموش بیٹھا رہا۔ ان کی نظرِ عنایت

کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی ایک دو گھنٹے کے بعد مہاتما جی نے اچھرو کی طرف دیکھا۔ وہ تو بہت پہنچے ہوئے تھے۔ انھوں نے اُس کا چہرہ دیکھتے ہی سب کچھ بھانپ لیا۔ اُسے کہنے لگے "اے گورمکھ آدمی! تو اتنا اُداس کیوں ہے؟ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے باطن میں کچھ عرصہ سے اچھائی اور بُرائی کی لڑائی رہتی ہے یعنی خیر و شر کی طاقتوں میں دَور شروع ہے مگر یہ اچھی طرح سمجھے کہ شیطانی قوتوں کو مٹانے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ اچھے اموروں کو اپنانے سے سب کام ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ سچ سچ بتا تو اب چاہتا کیا ہے؟"

اچھرو مہاتما کے مونہہ سے یہ باتیں سُن کر حیران رہ گیا کہ انھیں میرے اندرونی خیالات کی جانکاری کیسے ہو گئی اور وہ بھی پہلی ملاقات میں اسے یقین ہو گیا کہ مہاتما جی کی اتنی تعریف جو میرے دوست ہیرا لال نے کی تھی وہ صداقت پر مبنی تھی۔ مہاتما جی کے قدموں میں عجز و انکسار سے جھک کر کہنے لگا "مہاتما جی! آپ کے ویاکھیان سے مَیں آج بہت متاثر ہوا ہوں۔ سچ سچ آپ نے مجھے خوابِ غفلت سے جگا دیا ہے۔ میرے اندر کئی بُرائیاں ہیں، مَیں انھیں دُور کرنے کی ہر چند کوشش کرتا ہوں مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ یہ بُرائیاں میرے دل کے اندر گھر کر چکی ہیں۔ میرے پاس بدقسمتی سے سرمایہ بھی کوئی نہیں ہے۔ اگر کسی جائز ناجائز طریقے سے میرے پاس کبھی سرمایہ آ بھی جاتا ہے تو وہ ٹھہرتا نہیں۔ مَیں نے سُن رکھا ہے کہ آپ جیسے مہاتماؤں کی آشیرواد سے میرے جیسے گنہگاروں کی بگڑی سنور سکتی ہے: نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ مَیں بھی آپ کی نظرِ عنایت کا طلب گار ہوں۔ مجھے سیدھا راستہ دکھلایے۔ تا زیست میں آپ کا بندۂ بن دام بن کر رہوں گا۔"

مہاتما نے جانچ کر لیا کہ اس انسان کے اندر برائی پر نیکی آہستہ آہستہ غلبہ پا رہی ہے تو اسے کہنے لگے "اے بھائی! تو یچی یچی بات بتا کہ تیرا پیشہ کیا ہے؟ اس پیشہ کے علاوہ اور کوئی کام بھی تو جانتا ہے یا نہیں؟ اگر تو سچے دل سے میری نصیحتوں پر عمل کرنے کا وعدہ کرتا ہے تو تیری موجودہ زندگی اور آخرت بھی سنور جائے گی۔"

اچھرو کہنے لگا" مہاراج جی! میرا پیشہ چوری کرنا ہے اور اس کام میں میں پورا ماہر ہوں۔ آپ مہربانی کرکے کوئی ایسا طریقہ بتلایئے کہ میں چوری کا کام بھی کرتا رہوں اور ساتھ ساتھ میرا اُدھار بھی ہو جائے۔ اس کے علاوہ اور کوئی کام تو مجھے آتا نہیں اور اب اس عمر میں اور کوئی نیا کام مجھے آئے گا بھی نہیں۔ نہ ہی وہ میرے بس کا روگ ہے۔ آپ ست سنگ کے بارے میں بھی مجھے کچھ سمجھا دیں۔ میں تہہ دل سے مشکور ہوں گا لیکن میری عرض کو بھی نظر انداز نہ کرنا۔ میں آپ کی ہر نصیحت کو پلے باندھ کر اس پر عمل کروں گا۔"

مہاراج جی نے اس کا ٹیڑھا سوال سُنا تو کہنے لگے "پریمی بھگت! میں تیری صاف گوئی پر از حد خوش ہوں تو چوریاں بھی کرتا رہ مگر میری چند ایک نصیحتیں بھی سُن لے اور اُن پر عمل کرنے کا پرن کرلے اس طرح سے تیرا اُدھار بھی ہو سکے گا۔" اچھرو بولا "مہاراج! آپ سے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہمیشہ آپ کے دکھائے ہوئے راستہ پر گامزن رہوں گا خواہ مجھے اپنی جان بھی جوکھوں میں کیوں نہ ڈالنی پڑے"۔ اس قدر یقین دہانی کے بعد مہاتما جی نے اسے اپنا بصیرت افروز اُپدیش ان الفاظ میں دیا۔" سانچ برابر تپ نہیں جھوٹ برابر پاپ جن کے ہردے سانچ ہے ان کے ہردے آپ (سچ تپ سے بھی اونچا مانا گیا ہے۔ جھوٹ اور پاپ برابر ہیں جس انسان کے دل میں ہر وقت سچ ہے۔ اس دل کے اندر سمجھو کہ خود پرماتما رہتا ہے) تم چوری بھی کرتے رہو۔ مگر کبھی جھوٹ مت بولنا۔ ہمیشہ سچائی کا دامن پکڑے رکھنا جب انسان کے دل میں سچائی بھری ہوئی ہوتی ہے اسے تیرتھ یاترا کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ زمین و آسمان صرف سچائی کے سہارے قائم ہیں۔ پانڈوؤں کے بڑے بھائی یدھشٹر کا نام اُس کی سچائی کی وجہ سے آج تک عزت سے لیا جاتا ہے۔ سچائی جوان کے لیے ایک سیف کا کام دیتی ہے تو ایک بوڑھے کے لیے عصا کا۔ یہ ایک بیش قیمت سرمایہ ہے اسے کسی قیمت پر ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری ہمیشہ یہی دُعا ہونی چاہیے کہ اے پروردگار تو ہمیں ہمیشہ سچ بولنے کی جرأت اور طاقت عطا کر تاکہ جب تک زندہ رہیں لوگ ہمیں سچا کہیں اور آخرت میں بھی جب تیرے پیش ہوں تو سچے بن کر پیش ہوں۔

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں
آج تک کوئی رہرو اِس راہ میں بھٹکا نہیں

ست سنگ ایک ایسی سبھا ہے جہاں چوٹی کے وِدوان اور برہم رشی اپنی زندگی کے تجربات کے نچوڑ آپ کے سامنے اپنے اپنے طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ اُن کی کہی ہوئی باتیں دل کی گہرائیوں میں تیر کی طرح گھُس جاتی ہیں۔ برہمی کو چوں کہ ٹھوکر پر ٹھوکر لگتی ہے اس لیے اس کے اندر کی آنکھ بھی کھل جاتی ہے۔ اسے اپنانے سے آپ کی موجودہ نیکیوں کو اور چار چاند لگیں گے۔ دل کو ست سنگ سے دُکھ سُکھ میں صبر ملتا ہے۔ ہزاروں برس کی تپسیا اتنا پھل نہیں دیتی جتنا فائدہ کہ دو گھڑی کی ست سنگ سے ہوتا ہے۔ اس کا بیّن ثبوت تم خود آج مہیّا کر رہے ہو، اس لیے اگر آئندہ بھی ست سنگ جانے کا معمول بنا لوگے تو خود ہی محسوس کروگے کہ تمھاری عقل اور سمجھ میں کتنا نمایاں فرق آگیا ہے۔ اُس وقت مہاتما کی بات یاد کر لینا۔" اتنا کہتے ہی مہاتما جی وہاں سے عازمِ سفر ہو گئے۔ اچھرو نے پرنام کر کے اُن سے ہنسی خوشی چھٹی لی۔ دونوں کے چہروں پر ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ تھی۔ اچھرو کے دل کے شیشہ کی مَیں کچھ حد تک دُھل چکی تھی۔ اب وہ واپس اپنے گھر دل جمعی سے پہنچا کہ مہاتما جی کی مہربانی سے ایک بڑا ہی کارگر منتھیا ہاتھ لگ گیا ہے۔ جو تھوڑا بہت پاس تھا وہ سرمایہ بھی ختم ہو گیا تو اس نے تجویز بنائی کہ راجہ سری پور کے خزانے کو لوٹا جائے۔ اس طرح مہاتما کے اصُول پر کاربند ہوں گا تو اُس اصول کی بھی پکّی جانچ ہو جائے گی۔ جو شخص مدّتوں سے بُرے کاموں میں دن رات لگا ہوا ہو بھلا اُس کی عادت تھوڑے ہی دنوں میں کیسے بدل سکتی ہے؟ سخت سردی اور اندھیری رات تھی اچھرو اپنی منزلِ مقصود کی طرف چل پڑا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی رکاوٹیں اُس کے ارادے کو متزلزل نہ کر سکتی تھیں۔ وہ بڑی دلیری سے خزانہ کے گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر پہریدار انگیٹھی تاپ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور بھی سرکاری ملازم بیٹھے تھے۔ آرام سے گپیں ہانک رہے

تھے۔ پہریدار نے جب اچھرو کا سایہ دیکھا تو اسے للکارا اور پوچھا کہ "تم کون ہو؟" اچھرو نے بغیر کسی جھجک کے بڑی دلیری سے جواب دیا "چور"۔ پہریدار خود و اس کے ساتھی جو وہاں بیٹھے تھے، سب ہنس پڑے اور کہنے لگے "یہ تو کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔ جانے دو" اچھرو سچائی کا سبق پڑھ چکا تھا اب دوسری پہرہ چوکی پر پہنچا تو وہاں بھی یہی سوال جواب ہوئے۔ کسی نے اس کا رستہ نہ روکا حتیٰ کہ وہ خزانہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ بڑی چستی سے اس نے دروازہ کھولا۔ صندوق اور تجوریاں بھی کھول لیں۔ قیمتی ہیرے جواہرات وغیرہ اپنے تھیلے میں ڈالے۔ اپنے جسم کے اوپر کمبل اچھی طرح اوڑھ لیا اور مالِ مسروقہ کمبل کے اندر چھپا کر واپسی کا رخ کیا۔ اب واپسی پر بھی انہی پہریداروں نے سوال کیے "تم کون ہو اور کدھر سے آ رہے ہو؟" اچھرو نے اب کے بھی سچائی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، اسی طرح دلیری سے بولا "میں ایک چور ہوں۔ چوری کر کے واپس آ رہا ہوں" بھلا ایسی بات پر کوئی یقین کیسے کرتا، بات آئی گئی ہو گئی اور اچھرو مال مسروقہ لے کر بخیریت اپنے گھر واپس پہنچ گیا۔ خیال دماغ پر چھا گیا کہ مہاتما جی نے جو لفظ کہے تھے وہ سچ نکلے۔ سچائی میں تو واقعی بڑی برکت ہے۔ کسی پہریدار یا ملازم نے میرا بال بیکا تو کیا کرنا تھا میرے پاس آنے کی بھی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ اس طرح سے سچائی پر اس کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ حیران ہو کر اپنے آپ کہنے لگا کہ منہ مانگی مراد بھی پالی اور جھوٹ بھی نہ بولنا پڑا یہ سچائی کا ہی تو کرشمہ ہے۔

اگلے دن علی الصباح شہر کے ہر گلی محلے میں ہاہاکار مچ گئی کہ رات سرکاری خزانہ کسی نے لوٹ لیا۔ لوگ حیران ہو رہے تھے کہ جب اتنے سخت پہرے کے باوجود سرکاری خزانے کی سرکاری خزانے کی چوری ممکن ہے تو عام لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ راجہ نے اپنے دربار خاص میں تجربہ کار پولیس افسروں اور اپنے معتمد درباریوں کی ہنگامی میٹنگ بلا کر حکم دیا کہ "جس طرح بھی ہو سکے فوراً ناکہ بندی کر کے چوری کا سراغ لگایا جاوے اور اس کام میں ایک منٹ بھی ضائع نہ کیا جاوے تاکہ چور کو کڑی سے کڑی عبرتناک

سزا دی جائے۔ افسران نے تعمیلِ حکم تو کرنی ہی تھی۔ سب پہریداروں وان کے ساتھیوں سے بھی تفتیشِ حالات شروع کر دی۔" بتاؤ تم ڈیوٹی پر چوکس تھے۔ کوئی آتا جاتا دیکھا اور کسی کو روکا؟" جواب ایک ہی تھا۔" مہاراج! ہم اپنے اپنے دروازے پر پوری طرح چوکس تھے۔ ایک شخص اُدھر سے گزرا ضرور تھا جب ہم نے اُس سے اُس کے بارے میں سوال کیا تو اس نے اپنے آپ کو چور بتلایا۔"

"تم نے اسے پکڑا کیوں نہیں؟" " مہاراج! آپکے بھی ملازمت کرتے اتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ کیا کبھی کسی چور نے اپنے منہ سے یہ کہا ہے کہ میں چور ہوں؟ ہمیں اس کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ہم غلط فہمی میں رہ گئے۔ ہم نے دانستہ کوئی غلطی نہیں کی، اس لیے ہمارا قصور قابلِ معافی ہے۔"

تفتیش کنندگان نے یہ ساری بات من وعن مہاراجہ کے گوش گذار کی۔ انھوں نے حکم دیا۔ "ہم نے ایسا چور تو آج تک نہ دیکھا نہ سُنا۔ اب کام آسان ہو گیا ہے۔ اس کی سچائی قابلِ تعریف ہے۔ اس لیے سب جگہ مشتہری کر دو کہ سرکاری خزانے کا چور اگر از خود ہمارے دربار میں پیش ہو جائے تو مابدولت اُس کے سارے گناہ معاف کر دیں گے و نیز اسے دربار میں عہدۂ جلیلہ پر فائز کر دیا جائے گا۔" مہاراج کو یہ یقین تھا کہ چور ایک سچا آدمی ہے۔ اس نے پہلے بھی سچائی کو نہیں چھوڑا تو اب بھی سچائی کو نہیں چھوڑے گا۔

چنانچہ مشتہری ہو گئی، اچھرو نے بھی سُنی۔ مہاتما جی کے اُپدیش کا اثر ابھی قائم تھا۔ طبیعت میں اچھائی بُرائی پر غالب آرہی تھی۔ اندر سے آواز آرہی تھی کہ ہمیشہ سچائی کی فتح ہوتی ہے۔ تازہ حالات آنکھوں کے سامنے تھے، اس نے موقعہ غنیمت جانا۔ کسی سے صلاح مشورہ کیے بغیر اُسی طرح وہ تھیلا جس میں مالِ مسروقہ تھا اُٹھایا۔ کمبل کے نیچے چھپایا اور مہاراجہ کے دربار پہنچ کر دربان کو کہنے لگا۔" میری طرف سے مہاراج کو عرض کر دو کہ مشتہری کے مطابق چور حاضرِ خدمت ہے۔ قدم بوسی کا موقعہ بخشا جائے۔"

یہ پیغام ملتے ہی مہاراجہ نے اچھرو کو دربار میں بلوالیا۔ اور خلوت میں اُس سے یوں بات چیت ہوئی۔ دروغ برگردنِ راوی:

مہاراج: "تمہارا نام کیا ہے؟ کس جگہ کے رہنے والے ہو اور ہمارے سرکاری خزانہ کی چوری تم نے کی؟"

اچھرُو: "مہاراج بہادر! ہمیشہ سلامت رہو۔ مجھ گنہگار کا نام اچھرُو ہے اور میں ریاست ناہن کا باشندہ ہوں۔ سرکاری خزانے کی چوری میں نے اکیلے کی ہے۔ میرا کوئی ساتھی اس کام میں ساتھ نہ تھا۔"

مہاراج: "کیا وہاں خزانے پر پہریدار نہیں تھے۔ کیا انھوں نے تمھیں ٹوکا یا پکڑنے کی کوشش نہیں کی؟"

اچھرُو: "مہاراج جی: وہاں دو چوکیوں پر پہریدار موجود تھے۔ انھوں نے مجھے ٹوکا بھی تھا۔ میں نے سچ سچ کہہ دیا کہ میں ایک چور ہوں۔ انھوں نے ہنسی مذاق ہی سمجھا اور شاید اسی وجہ سے کسی نے مجھے پکڑنے کی کوشش نہ کی۔"

جب مہاراج نے مالِ مسروقہ کے متعلق دریافت کیا تو اچھرُو نے جلدی سے وہی تھیلا جو کمبل کے نیچے اب تک چھپا رکھا تھا، اُن کے سامنے پیش کر دیا۔ مہاراجہ صاحب نے خزانچیوں کو گننے کا حکم دیا، تو سارا مال درست پایا گیا۔ مہاراجہ صاحب نے اپنے وعدے کے مطابق اچھرُو کی بڑی عزت کی اور سب درباریوں کو مخاطب کر کے کہنے لگے "آپ سب کی نسبت مجھے یہ شخص زیادہ پسند ہے۔ تم کہتے کچھ ہو کرتے کچھ ہو۔ یہ شخص کتنا سچا اور ایماندار ہے۔ جس قدر مال سرکاری خزانہ سے یہ اٹھا کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا اُس سے اس کی پشتہا پشت فائدہ اٹھاتیں۔ مگر یہ شخص اتنا سچا ہے کہ اس نے پہریداروں کو بھی اپنی شناخت صحیح صحیح بتلائی اور پھر سارا سامان جُوں کا تُوں آج پیش کر رہا ہے، کوئی ایک چیز بھی گم نہیں ہے۔ اس سے صاف اور پکا ثبوت ملتا ہے کہ اس کے سوچ کا ڈھنگ یکسر بدل چکا ہے۔ لہٰذا ہم بدولت اسے اپنے دربار میں وزیرِ اعلیٰ کے عہدہ پر تعینات کرتے ہیں۔" اب اچھرُو ایک چور نہ تھا بلکہ ایک معزز شہری اور راجہ کا معتمدِ خاص تھا۔ اپنے محل میں رہتا تھا۔ دُنیا کے ہر قسم کے عیش و عشرت کے سامان موجود تھے۔ روپے پیسے کی فراوانی تھی۔

دل کھول کر غریب غربا اور مستحق حاجت مند اشخاص کی بلا لحاظ مذہب و ملت مدد کرتا تھا۔
اس کا خیال ہمیشہ اس بات پر ہوتا تھا کہ میرے پاس جو اس قدر مال و زر ہے مجھے ایک سانپ کی
طرح صرف اس کا نگہبان بننا مقصود نہیں ہے بلکہ میرا فرض اسے رہائے خیر میں صرف کرتا ہونا
چاہیے۔ اس طرح سے اُس نے اپنی زندگی اچھے ہی اچھے کاموں میں گزاری مگر موت کا وقت تو مقرر
ہے۔ آخر وہ دن آپہنچا اور وہ راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ جو اس کی ذات سے
فیض اٹھا رہے تھے، گریہ کناں تھے بلکہ در و دیوار بھی رو رہے تھے۔ اُس کی اچھائیاں لگاتار ست
سنگ میں جانے سے چمک اٹھی تھیں۔

بعد از مرگ اچھرو کو سزا جزا کے لیے دھرم راج کے جب پیش کیا گیا اور اس کا اعمال نامہ
دیکھا گیا تو اُس میں زیادہ تر بُرائیوں کا اندراج تھا۔ البتہ ایک دان کا ذکر بھی پایا گیا، یہ وہی دان
تھا جو کسی وقت اچھرو نے اپنی بھوک کو بالائے طاق رکھ کر ایک بھوکے مہاتما کو پیڑوں کا لفافہ دیا تھا۔
دھرم راج نے اپنے کرمچاریوں پر سوال کیا "بھوکے کے پیڑے کھا کر اس مہاتما نے کیا کرم کیا؟"
"مہاراج! بھوک کی وجہ سے وہ مہاتما بے چین ہو رہا تھا اُس کی طبیعت پرماتما کی طرف نہیں
لگ رہی تھی۔ بھوک مٹ جانے پر وہ از سرِ نو گیان دھیان میں لگ گیا"۔ دھرم راج نے اس
دان کے عوض اچھرو کو ایک دن کا سورگ عطا فرماتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ "اے پرانی! تو
سورگ پہلے جانا چاہتا ہے، یا پہلے نرک جانا چاہتا ہے؟ تیرے گناہوں کی وجہ سے باقی
عرصہ تجھے نرک میں ہی کاٹنا ہوگا، صرف ایک دن کا سورگ تیرے حصے آیا ہے"۔ اچھرو نے جواب
دیا: "مہاراج! مجھے پہلے ایک دن کا سورگ چاہیے"۔ وہ اپنے مَن ہی مَن میں سوچ رہا تھا کہ
سچ کا پھل تو میں نے رُوئے زمین پر اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ چور کا پیشہ بھی نہ چھوڑا اور ساتھ
ہی سچائی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کسی پہریدار نے مجھے پکڑنے کی کوشش نہ کی پھر مہاراج کے
دربار میں افضل ترین عہدہ پر متمکن ہوا۔ ست سنگ میں شمولیت کر کے اچھے سبق سیکھے اس طرح
سے نہ صرف زندگی بلکہ آخرت کا بھی سُدھار گیا۔ سادھو سے جو باتیں کبھی ہوئی تھیں وہ اب بھی

یاد آرہی تھیں۔ کیوں نہ اب دان دینے کا نتیجہ بھی دیکھا جائے۔ یم دُوت اچھرو کو سورگ کی جانب لے کر پہنچے تو وہاں اُس نے زور سے آواز لگائی "میں اپنی خوشی سے ایک دن سورگ کا دان کرتا ہُوں۔ ہے کوئی لینے والا؟" کسی نے ہاں کر دی۔ اچھرو یم دُوت کو کہنے لگا "آپ نے دیکھا کہ میں نے ایک دن کے سورگ کا پھل دان دے دیا ہے، اس لیے مجھے دھرم راج کے پاس واپس لے چلو۔" دھرم راج نے نیا حکم دیا "ایک دن کے سورگ کے دان کی وجہ سے اسے اب دس دن سورگ میں رکھو، پھر باقی ماندہ تمام وقت اسے نرک میں رکھنا۔" یم دُوت اچھرو کو دوبارہ سورگ کے دروازے تک لے گئے۔ اس نے اب وہاں دس دن سورگ کا دان دے دیا۔ چنانچہ یم دُوت اسے دھرم راج کے پاس پھر لے گئے۔ کہانی سُنائی اور حکم پُوچھا۔ حکم ہوا کہ "اس آخری دان کی وجہ سے وہ سو دن کے قیامِ سورگ کا حق دار ہو گیا ہے۔ اسے وہاں پہنچاؤ۔" اچھرو نے سورگ کے دروازہ پر اب کے بھی بطریقِ سابق عمل کیا تو یم دُوت پھر اسے دھرم راج کے پاس لے گئے۔ اس طرح سے وہ ایک ہزار دن کے سورگ کا حق دار بن گیا۔ اگلی دفعہ وہ دس ہزار دن اور اس سے اگلی دفعہ ایک لاکھ دن سورگ کا حق دار ہو گیا۔ اسے ایک پکا گُر ہاتھ آچکا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ اب یہ اس راستے سے ہٹنے والا نہیں، اس لیے اسے ہمیشہ کے لیے سورگ میں رہنے دیا گیا۔

○
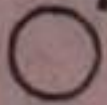
پربھو کی مایا

یہ روایت صدیوں پرانی ہے اور اس کا تعلق اُس زمانہ سے ہے جسے ہم عرفِ عام میں دواپر یگ کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہی زمانہ بھگوان کرشن کا تھا۔ پانچوں پانڈو یدھشٹر، ارجن بھیم، نکل اور سہدیو بھگوان کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور ان کا اکثر میل ملاپ ہوتا رہتا تھا۔

ارجن پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ کرشن جی پرماتما کے اوتار ہیں اور سولہ کلا سمپورن ہیں۔ اتنی قریبی رشتہ داری کے علاوہ اُن کی باہمی دوستی بھی بدرجہ غایت تھی اس لیے دونوں آپس میں بات چیت بڑی بے تکلفی سے کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ باتوں باتوں میں ارجن نے کرشن جی کو کہا "ہے پرتھوی ناتھ، آج آپ کے سامنے میں اپنی ایک دیرینہ دلی خواہش رکھنا چاہتا ہوں۔ کئی دفعہ پہلے بھی یہی بات منہ تک آئی لیکن کہنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ وہ یہ ہے کہ آپ ایک بار اس ناچیز کو اپنی مایا کا کرشمہ تو دکھلا دیں۔ دیگر لوگوں سے میں نے اس بارہ میں طرح طرح کی باتیں سُن رکھی ہیں میرے اوپر بھی کبھی کرپا ہو جائے تو آپ کی شان سے بعید ہوگا"
بھگوان نے برجستہ جواب دیا "ارجن! ہم مدتوں سے ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ آج آپ کی مانگ سے مجھے بڑی حیرانی ہو رہی ہے۔ آپ ایک ذی شعور انسان ہیں جب آپ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور آپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسی مانگ کر رہے ہیں تو کیا مجھے حیرانگی نہیں ہوگی؟ آپ جانتے ہیں کہ یہ دُنیا کتنی لمبی چوڑی ہے۔ اس پر کس قدر خلقت ہے۔ ہزاروں طرح کے چرند پرند اور جانور ہیں جن کا کوئی انت حساب ہی نہیں۔ ان کا بوجھ کس نے اٹھایا ہوا ہے؟ پانی کا خط

کتنا وسیع ہے۔ دھرتی پر بے شمار پہاڑ ہیں۔ کس سہارے کھڑے ہیں! اوپر نیلے آسمان کی چھت ہے۔ اسے کس نے تھام رکھا ہے؟ بغیر چوبوں کے کھڑا ہے۔ آسمان پر ان گنت تارے اور سیارے ہیں۔ چاند سورج ہیں۔ سب اپنے اپنے وقتِ مقررہ پر طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ ہر ایک سیارہ اپنی گردش میں لگا ہوا ہے۔ ہر ایک کا مقررہ راستہ ہے۔ ستارے وغیرہ اپنی اپنی ڈیوٹی میں لگے ہوئے ہیں۔ موسم اپنے آپ بدلتے رہتے ہیں۔ آخر کوئی تو ان کو چلانے والا ہے۔ کیا مجال کہ کبھی سرِ مو فرق بھی آجائے۔ نظامِ قدرت معیّن ہے۔ لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت ہزاروں سیلانے اِس بھید کا پتہ لگانے کی کوشش میں لگے رہے مگر سب ناکام رہے۔ مہارس، نجومی، عاقل، فاضل اپنی اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتے رہے۔ اسی طرح رشی منی لمبی تپسیائیں کرتے رہے مگر سب نے آخرکار ہار مان لی۔ کوئی میرے بھید کو نہ پاسکا۔ یہ سب میری مایا ہی تو ہے اچھا تو آپ نے اب جو اپنی خواہش ظاہر کی ہے۔ اسے پورا کرنا تو میرا فرض بنتا ہے۔ مناسب موقعہ پر ضرور پورا کروں گا۔ انتظار کیجیے یہ مشہ کا نوالہ نہیں۔"

پانچوں پانڈو بمعہ دروپدی جی کوروؤں کی لگائی ہوئی پابندی کے مطابق جنگلوں میں بن باس کے دن کاٹ رہے تھے۔ ایک دن کرشن بھگوان دوارکا سے ان کے پاس آپہنچے۔ بھوک نے انھیں بہت بے تاب کر رکھا تھا۔ دروپدی کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔" دروپدی، دروپدی! آج تو میں بھوک کی وجہ سے نڈھال ہو رہا ہوں۔ گھر میں کھانے کے لیے جو کچھ بھی موجود ہے جلدی سے لے آؤ۔ آج تو اتنی بھوک لگی ہے کہ میں کھانے کے بعد اشنان کروں گا، پہلے نہیں۔" دروپدی نے کھانے کی چیز تلاش کرنے کی ہر چند کوشش کی مگر کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی تو مجبوراً شرمندہ ہو کر بھگوان کو نمرتا سے کہنے لگی۔" بھیّا! آج اس وقت تو گھر میں کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے معاف کرنا مجھے آپ تھوڑا سا وقت دے دیں تو میں جلدی جلدی آپ کے لیے تازہ کھانا تیار کر لیتی ہوں۔ آپ تھوڑا سا وقت خوش گپیوں میں گذار لیجیے۔ ہاں تو ایک اور بات ابھی یاد آئی۔ آپ تو ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ بغیر اشنان کے کھانا کبھی نہیں کھانا چاہیے تو آج آپ کیوں

اپنا اصول توڑ رہے ہیں ؟" بھگوان کو اشنان کی بات بہت پسند آئی۔ کہنے لگے: "اچھا ہم نہلانے کے لیے ندی پر جا رہے ہیں۔ آپ تکلف مت کرنا۔ یہ مجھے سخت ناپسند ہے۔" یہ کہتے کہتے بھگوان تولیہ اور صاف کپڑے نکالنے میں مصروف ہو گئے۔ دروپدی نے موقعہ پا کر ارجن کو پاٹھ پڑھایا۔ "دیکھیے نہا کر جلدی جلدی واپس نہ آجانا۔ بھائی صاحب کی شان کے مطابق کھانا تیار کرنے میں کم از کم ایک گھنٹہ وقت درکار ہوگا۔ آپ جلدی آگئے تو سب کی ناک کٹ جائے گی اور مجھے بھی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔" ارجن نے دروپدی کی بات پلّے باندھ لی۔ وہ جان بوجھ کر بھگوان کو اس راستے سے گیا جدھر ایک عظیم الشان باغ آتا تھا۔ انھیں مخاطب کر کے کہنے لگا مہاراج! ذرا دیکھو تو سہی اس باغ میں کتنے خوب صورت پھل پھول کے پیڑ ہیں۔ پھلوں کے بوجھ سے ٹہنیاں نیچے کو جھک رہی ہیں۔ سرسبز اور شاداب ٹہنیوں پر طرح طرح کے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں جن کی خوشبو سے دماغ معطر ہو رہا ہے۔ نرگس و غنچۂ لالہ اپنی اپنی بہار دکھلا کر دل موہ رہے ہیں۔ ٹہنیوں پر پنچھی جھول رہے ہیں۔ جدھر بھی نظر جاتی ہے گویا سبزہ کی ایک چادر بچھی ہوئی ہے جو آنکھوں کو طراوت پہنچا رہی ہے۔ صحنِ چمن ایک لالہ زار بنا ہوا ہے۔ نسیم کے جھونکے ہر سو رواں ہیں جیسے باغِ بہشت کے دریچے کھل گئے ہوں۔ مرغانِ باغ کی خوش الحانی تو ذرا سماعت فرمائیے۔ پپیہے کی پی ہو، پی ہو، قمریوں کی کو کو۔ طاؤس کی پکار، بلبل کی چہک اور دوسرے بے شمار پرندوں کے دل کش زمزمے کتنے دل کش ہیں۔ اس پر کیف منظر میں کتنی جاذبیت ہے! آگے جانے کو قدم ہی نہیں اٹھ رہا۔ اگر اجازت ہو تو کچھ دیر اس رنگین ماحول سے لطف اندوز ہو کر نہانے جائیں۔ فرمائیے کیا خیال مبارک ہے؟ آخر حکم تو آپ کا ہی چلے گا۔"

بھگوان قدرے تلخی سے بولے: "ارجن میرے پیٹ میں تو چوہے کود رہے ہیں اور تجھے باغ کی سیر سوجھ رہی ہے۔ جب پیٹ میں روٹی نہ ہو تو ایسی چیزیں من کو نہیں بھا سکتیں۔ یہ سیر پھر کسی دن کے لیے ملتوی رکھو۔ آج جلدی سے اشنان کر کے کھانے پینے کے لیے واپس گھر چلیں۔ ایک

اور ضروری بات آپ سے ابھی کرنے والی ہے۔ دیکھیے پانی کے اندر میری ڈبکی عام طور پر بیس منٹ کی ہوتی ہے۔ نہا کر ہم دونوں میں سے جو بھی پہلے باہر نکل آئے گا جیت اسی کی مانی جائے گی۔ بتاؤ یہ شرط تمھیں منظور ہے؟" مہاراج! میری ڈبکی تو صرف پندرہ منٹ کی ہوتی ہے۔ اس لیے جیت تو لازمی میری ہی ہوگی۔ مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔" کرشن بھگوان پھر کہنے لگے۔ "میں نے غلطی کی جو اپنی ڈبکی کا صحیح وقت تمھیں پہلے بتا دیا۔ خیر جو کچھ کہہ دیا اب تو ہم اُس پر قائم رہیں گے۔ بات کے ہم دھنی ہیں۔ اب بات اس نتیجہ پر پہنچی کہ جو بھی اپنا وقت پورا کر کے ندی سے باہر پہلے نکل آئے گا جیت اُسی کی تصور ہوگی۔"

دونوں نے ندی میں ایک ساتھ ڈبکی لگائی۔ ارجن نے اپنا وقت پندرہ منٹ پورا ہوتے ہی ندی سے سر باہر نکالا تو اُس کی حیرانگی کی کوئی حد نہ تھی وہ کسی نامعلوم جگہ پر پہنچا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر ہر طرف نظر دوڑائی مگر کچھ سمجھ نہ آئی۔ پہننے کے لیے جو کپڑے ندی کے کنارے رکھ گیا تھا۔ وہ بھی دکھائی نہ دیے۔ نہانے کے وقت جو دھوتی باندھی تھی، وہی جسم پر تھی اور وہ بھی بالکل گیلی، کرے تو کیا کرے۔ پہننے کے لیے سوکھے کپڑے کہاں سے آئیں؟ بھگوان بھی نظر نہ آئے اور کوئی انسان بھی نظر نہ آیا جو اتنا تو بتا دے کہ یہ جگہ کونسی ہے ایک گھنا جنگل ہے۔ سنسان بیابان جگہ پر کون اس کی رہنمائی کرے۔ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ دُور نظر دوڑائی تو اس نے ایک کھیت میں کام کرتے ہوئے چند کسان دیکھے۔ انتہائی مشکل سے بھاگتا دوڑتا اُن تک جا پہنچا تب جان میں جان آئی۔ اُن سے پوچھنے لگا "بھائی صاحب! یہ کونسی جگہ ہے؟" انھوں نے جواب دیا "یہ ریاست منگھیر کی راجدھانی رام پور ہے۔" ارجن نے پھر سوال کیا "کرپا کر کے یہ تو بتا دیجیے کہ ہستناپور یہاں سے کس طرف کو ہے اور کتنے فاصلے پر ہے؟" ایک کسان بولا "ہم نے تو آج تک ہستناپور شہر کا نام ہی نہیں سنا۔ ذرا کھول کر بتاؤ۔" "شریمان جی! یہ شہر وہ جگہ ہے جہاں کوروؤں اور پانڈوؤں کا راج ہے اور جہاں کرشن بھگوان بھی اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔" "دیکھیے ہم نے تو کبھی کورو پانڈو کا نام ہی نہیں سنا اور نہ ہی آپ کے کرشن بھگوان کا نام سنا ہے۔" ارجن یہ جواب پا کر بہت گھبرایا۔ بار بار بھگوان کو یاد کرتے ہوئے کہنے لگا "ہے بھگوان میرا قصور

معاف کرنے کی کرپا کیجیے۔ میں ایسی دلدل میں پھنس چکا ہوں جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا یہ بھی پتہ نہیں کہ قسمت دھکیل کر مجھے کہاں لے آئی ہے۔ کرپا کر کے مجھے اپنے چرنوں میں بلا لو اور جلدی بلا لو نہیں تو میری بُری حالت ہو جائے گی۔ میری عقل تو جواب دے چکی ہے۔" قاعدہ ہے کہ جب انسان کو اور کہیں سے آسرا نہیں ملتا تو وہ پرماتما کی درگاہ پر آ کر شرن لیتا ہے اور سچے دِل سے جو دعا کی جاتی ہے وہ سُنی بھی جلد جاتی ہے۔ اس حالت میں بعینہٖ وہ سب کچھ وقوع پذیر ہُوا۔ اب رجن ندی کے اُس کنارے پر واپس آ گیا جہاں سے وہ پوچھ تاچھ کے لیے کسانوں کے پاس گیا تھا۔

قدرت کے کام بڑے عجیب ہیں۔ ریاست منگیر کے راجہ کی اچانک موت ہو گئی۔ شمشان گھاٹ جہاں راجہ کو سپردِ آتش کرنے کے لیے لایا گیا اسی ندی کے کنارے واقع تھا۔ ریاست کی رانی کو بھی ساتھ لے آئے کیوں کہ ریاست کے پُرانے قانون کے مطابق رانی نے بھی ستی ہونا تھا۔ چنانچہ اپنے خاوند کی چتا پر اسے بھی بٹھا دیا گیا۔ آگ کے شعلوں نے تھوڑے ہی وقت میں دونوں کو خاکستر کر دیا۔ رانی بیچاری نے جیتے جی سوزِ محبت میں جگر سوزی کی یا شاید اسے مجبوری کی حالت میں اپنا تنِ نازک شعلہ ہائے آتشیں کے حوالے کرنا پڑا۔ اُف ہے ایسے رسم و رواج پر، بہر حال یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ سب دیکھنے والوں اور سب رشتہ داروں کا چتا کی آتشِ سوزاں اور یہ بھیانک نظارہ دیکھ کر زہرہ آب آب ہو رہا تھا۔ اب درباریوں کے سامنے نئے راجہ کے انتخاب کا مسئلہ درپیش تھا۔ پنچایت کا فوری اجلاس بلایا گیا جہاں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ندی کے پاس جو اجنبی شخص سب سے پہلے نظر آئے اُسے ہی راجہ بنا دیا جائے، یہ سمجھ کر کہ وہ پرماتما کا بھیجا ہوا ہے۔

ارجن بیچارہ ندی کے کنارے عالمِ یاس میں سر جھکائے سوچ میں پڑا ہُوا کھڑا تھا۔ زمانہ بھر کے غموں نے اُس کے دلِ ناتواں پر پُوری طرح ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ شاید کسی طرف سے کوئی امید کی شعاع نظر

آجائے مگر وقت کے ساتھ ساتھ نا اُمیدی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس کی زندگی مایوسی و محرومی اور ناکامی کی آماجگاہ بن چکی تھی۔ عالم حیرت میں اُس کی آنکھوں کے سامنے جو نقشے گذر رہے تھے۔ وہ اُس کے دل پر ایک عجیب اثر پیدا کر رہے تھے۔ اُسے بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک کڑی آزمائش سے گذر رہا ہے؛ اور یہ سب کچھ بھگوان کا چمتکار ہے "کسی کے سب دن برابر نہیں جاتے" یہ کہاوت ہم اکثر سُنتے آئے ہیں۔ آئندہ سطور میں ہمیں اس کا بیّن ثبوت مل جائے گا کہ ارجن کے لیے پردۂ غیب میں کیا مخفی ہے۔

ریاست کے امیر وزیر اور عام پبلک اپنے فیصلے کے مطابق نئے راجہ کی تلاش میں اُدھر آنکلے جہاں ارجن ایک بُت بنا ہوا کھڑا تھا مگر اس کے چہرے پر نور برس رہا تھا۔ لوگ اس کے پاؤں پڑ گئے گویا انھیں بڑی تلاش کے بعد اپنا محبوب لیڈر مل گیا ہو۔ سب نے اس کے سامنے سر جھکایا اور بڑی عزت دی۔ وہ بیچارہ اپنی جگہ پر حیران ہو رہا تھا کہ آخر بات کیا ہے؛ جب لوگوں نے کھول کر بتایا تو اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ من ہی من میں پرماتما کی کمال مہربانی کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ واقعی غیب کی باتیں ہماری سمجھ اور عقل سے باہر ہیں؛ اشارہ تیرا کافی ہے، گھٹانے میں اور بڑھانے میں۔ لوگ اسے جلوس کی صورت میں راجدھانی لے آئے۔ راستے میں اُس پر پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ لوگ دو رویہ قطاریں بنا کر سواگت کے لیے کھڑے تھے۔ اور ہر کہ ومہ مرد و زن حتیٰ کہ بچے بھی اسے پھولوں کے ہار پہنا رہے تھے۔ تلک کے بعد رسمِ تاجپوشی ادا کی گئی اور راجن مہاراج کو تختِ شاہی پر بٹھا دیا گیا۔ یہ خوشی کی خبر آناً فاناً ریاست کے ہر شہر اور ہر گلی کوچے میں پھیل گئی۔ اور ہر گھر میں دیپاولی کی گئی۔ ارجن بھی فرطِ مسرت سے جھوم رہا تھا۔ آخر ریاست کا راجہ جو بن گیا تھا۔ ایک کمی جو وہ بُری طرح سے محسوس کر رہا تھا وہ تھی مستقل جُدائی اپنے بھائیوں کی، اپنے دوستوں رشتہ داروں اور اپنی بیوی کی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ پیچھے سے دَوڑ کر کون ہلا رہا ہے۔ یہ سب بھگوان کا ہی تو اعجاز تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ پُرانے دُکھ اور مصیبتیں بھول ہی جاتی ہیں۔ آہستہ آہستہ راج پاٹ کے کام میں دل لگ گیا۔ حکومت کا نشہ تو اپنے اندر ایک خاص جاذبیت رکھتا ہے۔

اس طرح وقت گذرتا گیا۔ امرا وزرا نے بڑے سوچ کے بعد راجہ کی شادی کے لیے ریاست کے معزز گھرانے کی ایک دخترِ نیک اختر سنتوش کماری کا انتخاب کیا۔ اسے ریاست کی خوب صورت ترین دوشیزہ سمجھا جاتا تھا اور وہ کئی صفات سے متصف تھی۔ یہ خوش ادا، شیریں سخن، ہمینتی لڑکی حسن وجمال میں اپنی نظیر آپ ہی تھی۔ ہونٹوں پر کلیوں جیسی مسکراہٹ اور معصوم تبسّم سے اس نے راجہ پر ایک طرح کا جادو کر رکھا تھا۔ اطاعت وفرماں برداری کا چندن ہار اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اور شرم وحیا اُس کی گھٹی میں تھی۔ اخلاص محبّت اور وفاداری کی اس جیتی جاگتی مُورت نے سارے محل پر اپنا نہ مٹنے والا ایک نقش بٹھا رکھا تھا۔ عام پبلک میں وہ صرف شاہی تقریبات کے موقع پر آتی تھی اور وہاں بھی یہ شرم وحیا کی پتلی غنچے جیسے منہ کو کم ہی کھولتی تھی۔ داد و دہش میں راجہ سے بھی بڑھ کر یہ راج ماتا حصّہ لیتی تھی غریب مسکین، اپاہج اور بیوہ یتیموں کی بھلائی میں ذاتی دل چسپی لیتی تھی، دیگر سب لوگ بھی اُس کے بڑے مدّاح تھے۔ قدرت نے اس طرح سے ارجن کی ایک بڑی کمی پُوری کر دی تھی۔ راجہ ارجن کو رانی دروپدی کی جُدائی جو اکثر شاق گذرتی تھی اب اتنا نہ ستا سکتی تھی۔

راجہ ارجن کے اس طرح سے دس بارہ سال عیش وعشرت اور کامرانی میں انتہائی خوشی سے گذر رہے تھے۔ ریاست کے لوگ قدرتی طور پر سادہ بول چال میں شیریں اور حکومت کے وفادار تھے۔ نظم ونسق کے اصولوں کے پابند تھے۔ ہر طبقہ و ہر فرقہ دوسرے طبقہ اور فرقوں کے مذہبی خیالات کی قدر کرتا تھا۔ جھوٹ اور دغابازی اور مکر فریب نام ونشان کو نہ تھا۔ خالص کھانے کی چیزیں سستے داموں پر بکثرت دستیاب ہوتی تھیں۔ انصاف سستا اور فوری ملتا تھا۔ گویا کہ صحیح معنوں میں رام راج تھا۔ مگر بُرا ہو اس فلک کج رفتار کا۔ یہ خود تو ہر وقت چکّر میں رہتا ہی ہے۔ دوسروں کو بھی چکّر میں رکھنا چاہتا ہے۔ کسی کی خوشی اسے زیادہ عرصہ کی ہرگز پسند نہیں ہے۔ راجہ ارجن بھلا اس قانون سے کیسے مستثنیٰ رہ سکتا تھا، ہر کمالے را زوالے و ہر زوالے را کمال۔ ترقی کے بعد تنزّلی اور ہر تنزّلی کے بعد ترقی اصولِ قدرت ہے۔

قدرت کا کرنا کیا ہوا کہ مختصر علالت کے بعد رانی سنتوش کماری پرلوک سدھار گئی رفیقۂ حیات کا ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانا ایک صدمۂ جانکاہ تھا اور راجہ کو اس حالت میں انتہائی افسوس ہونا قدرتی امر تھا۔ ایسی نیک دل راج ماتا کی موت پر رعیت بھی گریہ کناں تھی۔ زار و قطار رو رہی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ در و دیوار بھی رو رہے تھے۔ ریاست میں ہر طرف ایک کہرام سا بچ رہا تھا مصیبتیں جب بھی آتی ہیں اکٹھی ہی آتی ہیں۔ راجہ کو اب تک ریاست کے ایک عجیب و غریب رواج کا پتہ ہی نہ تھا۔ وہ یہ کہ اگر راجہ کی موت واقع ہو جائے تو رانی کو اس کے ساتھ ستی ہونا پڑتا تھا، اور اگر خدانخواستہ رانی کی موت پہلے ہو جائے تو اسی طرح راجہ کو بھی رسمِ ستا پوری کرنی ضروری تھی۔

ناظرین! جس ملک میں راجہ کی موت پر رانی کا ستی ہونا ضروری سمجھا گیا ہو تو اس ملک میں پھر رسم ستا پر بھی کیا جائز اعتراض وارد ہو سکتا ہے؟ راجہ ارجن کو اس قانون کے مطابق تیار رہنے کی اطلاع دے دی گئی۔ جان تو ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے۔ راجہ نے اپنے خاص مصاحبوں اور خوشامدیوں کی بہت منت سماجت کی بھکیہ پروہت کو بھی لالچ اور طمع دیا ہر طرح سے ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ آخر وزیر کی طرف سے بھی ٹکا سا جواب ملا کہ "ایسا ہماری ریاست کے آئین و قانون میں لکھا ہوا ہے ہم سب اس کے پابند ہیں ہم مجبور ہیں۔ اس قانون پر تو کاربند رہنا ہی پڑے گا" راجہ پر اب یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ چھٹکارا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ یہ ساری پبلک ایک طرف اور میں اکیلا ایک طرف۔ اکیلا ہونا فی زمانہ گناہ ہے۔ تو اس نے آخری ایک اور کوشش کرنے کی ٹھانی۔ سب لوگ راج کی میت کے اردگرد ہجوم کی صورت میں مجتمع تھے۔ وہ دردبھری آواز سے کہنے لگا "جنتا کے ہاتھ میں بڑی طاقت ہوتی ہے چند سال پہلے آپ لوگوں نے ہی میری کتنی عزت کی تھی اور مجھے تخت پر بٹھایا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ رفاہ عامہ کے جتنے کام میں نے کیے ہیں وہ منہ بولتی تصویر ہیں۔ رحم و کرم اور انصاف کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا ہے رعایا کو ہمیشہ آسودہ

دیکھنے کی میرے من میں لگن رہتی تھی، بتاؤ اب میرا کونسا قصور تمھارے علم میں آگیا ہے جس کی پاداش میں مجھے سزائے موت دی جا رہی ہے۔ پہلے ہی میں تورانی کی موت سے غم والم میں ڈوبا ہوا ہوں اور اب آپ لوگ ناکردہ گناہوں کی بھی مجھے سزا دینے پہ تلے بیٹھے ہیں۔ آپ اپنا دیا ہوا تاج و تخت واپس لینا چاہتے ہو تو خوشی سے لو مگر میری جان تو نہ لو۔ اس پہ آپ کا مطلقاً کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ یہ بتائیے کہ رسمِ ہاجیوشی کے وقت ان امیروں وزیروں یا مکھیہ پروہت نے یہ قانون میرے کو تبلایا تھا؟ میں علانیہ کہتا ہوں کہ کسی فردِ بشر نے مجھے آج تک بھی ایسا نہیں بتلایا۔ اگر مجھے شروع ہی میں کسی نے تبلا دیا ہوتا تو شاید واقعات کا رخ کچھ اور ہی ہوتا۔ آپ کرپا کر کے میری مودبانہ درخواست پر ایک دفعہ پھر نظرِ ثانی کریں۔ میں رائے عامہ کی تعمیل کروں گا۔" لوگوں نے جو فیصلہ پہلے کر لیا تھا اُس سے سرِمو کی بیشی کرنے کو تیار نہ ہوئے۔ طوطی کی آواز نقار خانے میں کون سنتا ہے؟ رانی کی ارتھی اٹھائی گئی تو راجہ کو بھی ساتھ گھسیٹ لیا گیا اور پبلک شمشان گھاٹ جا پہنچی۔ راجہ کو آدیش دیا گیا کہ ندی میں اشنان کر لو تاکہ تمھیں جلانے سے پہلے تمھارا جسم ہر قسم کی آلائشوں سے پاک صاف ہو جائے۔ مجبوراً ارجن بیچارہ ندی میں غوطہ لگانے کے لیے اُترا۔ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ کہاں گئی۔ وہ شوکت و رفعت اور کہاں گئی وہ دولت و ثروت۔ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔ تقدیر کے نوشتے کو تو انسان ٹال نہیں سکتا۔ یہ زندگی میرے پاس ایشور کی دی ہوئی چند روزہ امانت تھی۔ اب اگر وہ واپس لینا چاہتا ہے تو میں بے بس ہوں۔ اس کی رضا کے آگے تو جھکنا ہی پڑے گا۔ ریاست کے بے وفا لوگوں نے کہیں کا نہ رکھا: بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔ زندگی ابدی تو ہے نہیں۔ گل جو کھلتا ہے وہ مرجھا بھی جاتا ہے۔ خاموشی میں بھگوان کے آگے پرارتھنا کرنے لگا کیونکہ مصیبت کے وقت وہ ہمیشہ اپنے بھگتوں کی رکھشا کرتے آئے ہیں۔ ارجن کا بھگوان پر اٹل وشواس تھا کہنے لگا "ہے بھگوان! میں سخت اندھکار میں ہوں۔ آپ بخشنار ہو۔ میری تو بہ لو آگئی ہے۔ موت سامنے نظر آ رہی ہے۔ صرف تیری غیبی طاقت ہی اب مجھے بچا سکتی ہے۔ انتریامی پربھو! تیری

قدرت اپرم پار ہے۔ میں تو اب شمع اخیر شب ہوں۔ میں تیری شرن پڑتا ہوں۔ میری لاج رکھ لے۔ اور یہ شعر وردِ زبان تھا۔

رحمت پہ تیری میرے گناہوں کو ناز ہے
بندہ ہوں جانتا ہوں تو بندہ نواز ہے

ارجن کی سچے دل سے نکلی ہوئی یہ پرارتھنا فوراً سنی گئی۔ بھگوان نے اپنی مایا کا کرشمہ دکھایا۔ غوطہ لگانے کے بعد ارجن ندی سے باہر ہی نہ نکلا۔ لوگوں نے بہت چھان بین کی ہر چند تلاش کی مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ وہ تو اب ٹھیک اسی جگہ پہنچ چکا تھا جہاں اس نے کبھی ندی میں ڈبکی لگائی تھی۔ دیکھ کر حیران پریشان ہو گیا کہ اپنے سوکھے کپڑے وہیں دھرے ہیں۔ جہاں وہ خود رکھ گیا تھا۔ چند منٹوں بعد بھگوان کرشن نے بھی ندی سے سر باہر نکالا، آنکھیں چار ہوئیں تو ارجن کی جان میں جان آئی۔ اب بھگوان اسے کہنے لگے "ہے ارجن! آج تو تو بازی لے گیا۔" ارجن اپنی جگہ پر سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ یہ سب تماشا آنکھوں کے سامنے کیا ہو رہا ہے۔ اور بھگوان کیا کہہ رہے ہیں؟ جواب کیا دیتا۔ سر جھکا کر نمسکار کر دیا۔ اب دونوں نے اپنے اپنے کپڑے زیب تن کیے اور گھر جا پہنچے۔ دروپدی نے دیکھا کہ یہ تو اشنان کر کے واپس بھی آگئے ہیں۔ ارجن کو علیحدہ بلا کر کہنے لگی "میں نے آپ کو تاکید بھی کی تھی کہ اشنان میں ضرور ایک گھنٹہ لگانا مگر آپ آدھ گھنٹہ میں ہی واپس آگئے۔ آٹا گوندھا رکھا ہے۔ دال چولھے پر چڑھی ہے۔ دوسری انگیٹھی پر چاول پک رہے۔ ابھی کچے پکے ہیں۔ یہ کام ہو جائے تو چپاتیاں تیار کروں گی۔ بتائیے بھگوان کے لیے مرغوب میٹھی چیز کب تیار کروں گی؟ شرمندگی تو مجھے اٹھانی پڑے گی۔ سب مجھے ہی کام میں سست کہیں گے۔ آپ کو کیا؟

ارجن دل میں سوچنے لگا۔ یہ کیا جادو ہے۔ میں تو ریاست منگھیر میں دس بارہ سال حکومت بھی کر آیا اور ادھر دروپدی جی کا گلہ ہے کہ ہم وقتِ معین سے پہلے صرف آدھ گھنٹے میں ہی اشنان

کر کے گھر واپس آ گئے۔ دروپدی جی نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا" میرے پرماتما! تو ہی مجھے اس بھول بھلیاں سے نکال"۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بھگوان کے پاؤں پکڑ کر کہنے لگا "مہاراج! آپ آفتاب ہیں میں ذرہ۔ آپ شعلہ ہیں میں خس و خاشاک۔ میرا علم تو بالکل محدود ہے۔ میں آپکے سامنے ایک طفلِ مکتب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ آپ کو ساری دُنیا کے واقعات کا پُورا پُورا علم ہے۔ میں آپکے سہارے جی رہا ہوں۔ میں گھپ اندھیرے میں ہوں۔ میری عقل جواب دے چکی ہے۔ مہربانی کر کے مجھے ایک بات تو بتلا دیجیے۔ اپنے خیال کے مطابق جس کے دُھندلے سے نقوش اب بھی میرے ذہن میں ہیں۔ میں ایک ریاست میں کئی سال حکمران کر آیا ہوں اور تب گھر واپس لوٹا ہوں جب کہ دروپدی جی کے کہنے کے مطابق ہم اشنان کر کے صرف آدھ گھنٹے میں ہی واپس آ گئے ہیں۔ میں کسے سچا کہوں اور کسے جھوٹا۔ اپنے آپ کو یا دروپدی جی کو؟ اصلیت صرف آپ ہی جانتے ہیں۔ آپ جب تک میری اس اُلجھن کو نہ سلجھائیں گے۔ تب تک میں تو آپکے پاؤں پکڑ کر ہی بیٹھا رہوں گا، کھانا پینا مجھ پر حرام ہے۔ میرے دل کا سکون تو برباد ہو چکا ہے۔ میرا جو حال ہوا ہے اُس کی وجہ سے میرے دلی جذبات تہہ و بالا ہو چکے ہیں۔ انتریامی! یہ سب کچھ آپکے علم میں ہے۔ اب آپ ہی کرپا کریں۔ کرشمہ دیکھتا دیکھتا میں تو ایک عذاب میں پھنس گیا۔" یہ الفاظ سُن کر کرشن بھگوان نے ارجن کو پریم بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور کہنے لگے "ارجن شاید تجھے بھول گیا کہ کبھی آپنے مجھے اپنا اعجاز دکھانے کی فرمائش کی تھی۔ اب تمہیں اعجاز دکھایا ہے تو تم کو یہ سمجھ ہی نہیں آ رہی کہ دونوں باتوں سے صحیح کونسی ہے اور کونسی غلط۔ تمہارے پاس بھی میں سمجھتا ہوں کہ بہت عقل ہے۔ تمہیں خود ہی اس بات کا فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔ اچھا آپ نے اپنی کم فہمی کی بات کہی ہے۔ سُنیے میں ہی بتلا دیتا ہوں۔ یہ دونوں باتیں ہی درست ہیں۔ آپ حکومت بھی دس بارہ سال لگاتار کر آئے اور ایک گھنٹہ سے پہلے اشنان کر کے گھر واپس بھی آ گئے۔ کوئی بات بھی غلط نہیں۔ آپ کو اپنی مایا کا چھوٹا سا کرشمہ دکھایا تو تمہیں سمجھ ہی نہیں آ رہی۔ اب چھوڑیے میرے پاؤں۔ آؤ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ دروپدی جی کھانا پروس کر انتظار میں ہوں گی۔

وہ ایک گھنٹہ وقت کھانے کی تیاری کے لیے چاہتی تھیں۔ سو وہ بھی پورا ہو چکا۔"

ارجن بولا:"میرے سوامی! آپ کی کرپا سے اب میری چشمِ دل وا ہو گئی ہے، اور میرا روم روم کھِل گیا ہے۔ مجھے دل کی شانتی نصیب ہو گئی ہے۔ میرے خیالات اور جذبات میں بھی اعتدال اور صفائی پیدا ہو گئی ہے۔ آئندہ میں ایسی مانگ کرنے کی ہرگز غلطی نہیں کروں گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ رہی تھی۔ یہ آنسو اظہارِ شکریہ و اظہارِ عقیدت کے تھے۔ ناظرین! آپ ہی بتائیے کہ اس سے بڑھ کر اس غرض کے لیے بھلا اور کونسا بہتر طریقہ ہو سکتا تھا۔ بھگوان نے اُسے اُٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا، اور دونوں کھانے پر بیٹھ گئے۔ دروپدی ان کی سب باتیں سُن رہی تھی اور زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔
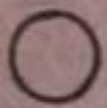
انوکھا انتقام

برہات پرانت کے ضلع روہتک میں ایک مشہور گاؤں تلونڈی ہے وہاں کسی وقت دو بھائی چوکھانند اور ہیرانند رہا کرتے تھے وہ ایک مرفہ حال گدڑ خاندان کے معزز رکن تھے۔ بیویاں دونوں کی پچھلے دو چار برس میں پرلوک سدھار گئی تھیں۔ چوکھانند لاولد تھا جب کہ ہیرانند کا ایک لڑکا تھا۔ لڑکے کا نام ہربنس لال تھا۔ وہ خوب صورت بھی تھا اور تابع دار بھی۔ وہی ان دونوں بھائیوں کی آنکھ کا تارا تھا اور وہ اسے بدرجۂ غایت پیار کرتے تھے۔ اپنی آنکھوں سے اسے ایک لمحہ کے لیے بھی اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ انھوں نے تلونڈی میں ہی کریانہ کی دکان کھول دی تھی دکان تو متوسط درجے کی تھی۔ مگر ضروریاتِ زندگی کی تقریباً سبھی چیزیں اس دکان پر مل جاتی تھیں چونکہ ہربنس لال بہی کھاتے کے اندراجات وغیرہ کے کام میں ابھی طفلِ مکتب تھا اس لیے دونوں بھائیوں سے ایک بھائی کا دکان پر ہربنس لال کے پاس موجود رہنا ضروری تھا۔ ان دونوں بھائیوں کا آپس میں اتنا پیار تھا کہ دوسروں کے لیے باعثِ رشک تھا۔ ان میں سے ایک نے جو کہہ دیا، یا کر دیا دوسرے کو اس میں رخنہ اندازی کا کوئی حق نہ تھا۔ اتفاق میں برکت ہوتی ہے۔ ہر کام میں فتح اور کامیابی ان کے قدم چومتی۔ وہ مٹی کو ہاتھ لگاتے تو وہ بھی سونا بن جاتی۔

ان بھائیوں کی ایک دلچسپ مگر مضحکہ خیز بات جو ہر جلسہ میں اور ہر اکٹھ میں زیرِ بحث آتی تھی وہ تھی جوتا ایک اور پہننے والے دو۔ انھوں نے ایک ہی جوتا رکھا ہوا تھا۔ جب چوکھانند

کو بمرور کی ہیں کہیں جانا پڑ جاتا تو وہ پہن لیتا اور اگر کبھی ہیرانند کو کہیں جانا پڑ گیا تو وہی جوتا وہ پہن لیتا۔ یہ ایک مذاق کا مضمون بنا ہوا تھا۔ کئی لوگ تو اس کی وجہ یہ سمجھتے کہ دونوں بھائی خوب کھانے پینے والے ہیں۔ اور ان کے پاس دوستوں یاروں کا اکثر جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ اس لیے یہ اپنی کمائی کھانے پینے میں ہی لگا دیتے ہیں۔ دوسرے بھائی کے لیے علیحدہ جوتا خریدنے کی طاقت ہی کہاں؟ کئی دیہاتی اسے ان کی کنجوسی پر محمول کرتے تھے۔ ان لوگوں کے خیال میں وجہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اسے ان کی پوزیشن سے گراوٹ کا نام دیتے تھے۔ اور ان پر طرح طرح کے فقرے چست کرتے اور پھبتیاں اڑاتے مگر ان بھائیوں کی بلا سے۔ طعنے سُن سُن کر جب وہ زیادہ تنگ ہو جاتے تو وہ کہہ دیتے۔ "ہوا چلتی رہتی ہے۔ کُتے بھونکتے رہتے ہیں۔" کسی کی طعن و تشنیع انھیں اپنے راستے سے دُور نہ کر سکتی تھی۔ لوگوں کو عام طور پہ یہ ایک غلط فہمی تھی۔ دونوں بھائیوں کے پاس ایک جوتے کا مطلب دراصل یہ تھا کہ ان میں سے ایک ضرور دکان پر ہر وقت موجود رہے اور ہربنس لال کی رہنمائی کرتا رہے۔ اس دکان پر واجبی نرخ اور پورا تول کا اصول چلتا تھا۔ دغابازی اور ملاوٹ کا اندیشہ نہ تھا۔ نرخ ہر چھوٹے بڑے کے لیے ایک تھا اور سب سے بڑھ کر تھی ان کی میٹھی زبان۔ "زبان شیریں ملک گیریں۔" دکان سے بھی معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ اور بڑے بھائی نے غیر منقولہ جائیداد کی خرید و فروخت کا دھندہ بھی کر رکھا تھا اور یہ بھی بڑا منفعت بخش تھا۔ ضرورتمند کوئی نہ کوئی گاہے بگاہے آجاتا تھا تو اس سے سستے داموں میں جائیداد خرید کر لیتا اور جب مناسب موقعہ دیکھتا اسے بیچ ڈالتا۔ بعض دفعہ تو وہ جائیداد دوگنے چوگنے پیسے دی جاتی تھی اور وہ اس معاملہ میں گانٹھ کا پورا تھا۔ کسی کی شرم یا لحاظ سے اُسے ہرگز کوئی سروکار نہ تھا۔ واقف کاروں کو بھی نہ بخشتا تھا۔ کھلم کھلا کہا کرتا تھا کہ "یہ تو ایک بیوپار ہے۔ لحاظ کا ہے کا؟"

وقت کا تیز رو دریا بہتا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد ہربنس لال نے جوانی میں قدم رکھا تو دونوں بھائیوں کو اس کی جلد شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ روٹی پکانے کے لیے ہر روز جو بھاڑ جھونکنا

پڑتا ہے۔ اس سے بھی وہ جلد از جلد نجات پانا چاہتے تھے اور عزیز کی شادی خانہ آبادی کی خوشیاں بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ چوکھا نند گھر میں بڑا ہونے کی وجہ سے مکھیہ اور چودھری بنا ہوا تھا اور گھر میں اس کی منظوری کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ وہ ایک جابر قسم کا انسان تھا۔ رشتہ کے لیے اس نے سب ملنے والوں سے کہہ رکھا تھا مگر بار بار یاد دہانی کے باوجود ابھی کہیں سے کامیابی کی شعاع نظر نہ آ رہی تھی۔ ہر کام کا وقت معیّن ہے۔ کسی نے درست ہی تو کہا ہے: "بیش از قسمت و پیش از وقت چیزے میسّر نمی آید"۔ (تقدیر کے لکھے ہوئے سے زیادہ اور وقت سے پہلے کسی کو کچھ نہیں ملتا۔)

قدرت کے کام بڑے نیارے ہیں۔ پرماتما سب کا کارساز اور مسبّب الاسباب ہے۔ ایک دن تلونڈی کے حجّام شام لال کے پاس قادر آباد سے رام لال حجّام آیا۔ اگلے وقتوں میں رشتے ناطے کا کام انھی حجّاموں کے ہی سپرد کیا جاتا تھا۔ چائے پانی سے فارغ ہو کر رام لال نے یوں بات چلائی: "بھائی شام لال! کئی جگہوں سے پھر کر میں اپنے ججمان سیٹھ امیر چند کی دختر نیک اختر کے لیے موزوں ور کی تلاش کرتے کرتے آپ کی امداد لینے کے لیے آپ کے پاس پہنچا ہوں۔ لڑکی کی عمر بیس سال کے قریب ہے اور خوب صورت ہونے کے علاوہ پڑھی لکھی بھی ہے۔ امورِ خانہ داری سے اچھی طرح واقف ہے۔ شیتل سبھاؤ کی ہے۔ سیٹھ امیر چند دو تین سو بیگھے اراضی کا واحد مالک ہے۔ اور صاحبِ حیثیت ہے۔ شاید آپ نے کبھی ہمارے گاؤں میں سیٹھ جی کی کوٹھی دیکھی ہو وہاں اس طرز کی اور کوئی کوٹھی نہیں ہے۔ گائیں بھینسیں اور گھوڑیاں رکھی ہوئی ہیں۔ علیحدہ اصطبل بنایا ہوا ہے۔ مہمانوں کے لیے انھوں نے مہمان خانہ بنایا ہوا ہے۔ باہر سے آنے والے مسافر اور خاص طور پر سرکاری افسر اسی مہمان خانہ میں آکر فروکش ہوتے ہیں کیونکہ ان کو وہاں سب سہولتیں مل جاتی ہیں۔ سیوا کے لیے اَن گنت نوکر چاکر رکھے ہوئے ہیں۔ کئی برادریوں اور سنستھاؤں کے وہ سرکردہ رکن ہیں۔ اور ظاہری نمود و نمائش میں پورا یقین رکھتے ہیں۔ آپ کرپا کر کے اپنے گاؤں میں اچھا خاندان اور کوئی اچھا

لڑکا مجھے تبلائیں" شام لال نے سب طرف نظر دوڑائی اور کہنے لگا" بھائی رام لال! میری نظر میں اس وقت ایک ہی لڑکا ہے۔ اس کا نام ہربنس لال ہے۔ کریانے کی متوسط درجے کی دکان ہے۔ دو بھائیوں کے گھر یہی اکیلا لڑکا ہے۔ لڑکے کی ماں فوت ہو چکی ہے اور بہن ہے ہی نہیں۔ لڑکے کی عمر بھی ٹھیک ہے۔ چال چلن کی بھی کبھی کوئی شکایت نہیں سُنی۔ بازار کلاں میں اُن کی دُکان ہے، وہاں چلے جائیے۔ اِدھر اُدھر سے بھی پوری تسلی کیجیے۔ کل کو میرے اوپر کوئی گلہ نہیں آنا چاہیے۔ آپ بھی اس اہم کام کو ہوشیاری سے کرنا۔ آپنے اور ہم نے تو آخر گاؤں میں ہی رہنا ہے۔ اپنے ججمان کی وفاداری اور نمک حلالی ہم پر فرض ہے"

رام لال حجام پتا لے کر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ ہربنس لال گاہکوں کا خوش اسلوبی سے بھگتان کر رہا تھا۔ تانتا بندھا ہوا تھا، مگر پھر بھی وہ ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ دُکان کے باہر چوکھانند مونڈھے پر بیٹھا ہوا دو تین آدمیوں سے گپیں ہانک رہا تھا۔ حجام نے اپنی سمجھ داری سے ہی قیافہ سے معلوم کر لیا۔ نمرتا سے نمسکار کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ چوکھانند کو اپنی آمد کا مقصد اور شام لال حجام سے ملاقات کا ذکر کیا۔ چوکھانند کو تو اس گھڑی کا کئی مہینوں سے انتظار تھا۔ حجام کی اس نے خوب خاطر مدارات کی اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس کے ججمان کے احوال پوچھنے شروع کیے۔ حجام بڑا چالاک تھا۔ وہ چوکھانند سے باتیں بھی کرتا رہا اور اس نے گاہکوں کی بھیڑ، گاہکوں کے ساتھ سلوک اور کانٹے پر بھی نظر رکھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ نیک کمائی کھانے والے ہیں اور ایک گاہک بھی ناراض نہیں گیا۔ حجام نے اپنے ججمان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے اور انھیں اپنی برادری اور ڈیرہ ککرڈ کا معزز ترین رُکن تبلایا۔ اس کی سخاوت کی تعریف کرتے ہوئے اس کا شجرۂ نسب راجاؤں سے جا ملایا اور اسے اپنے وقت کا حاتم طائی تبلایا۔ نمود و نمائش کی تعریف کرتے کرتے تو اس کی زبان ہی تھک گئی۔ چوکھانند بھی اپنی جگہ پر بہت ہوشیار تھا۔ ساری باتیں آرام سے سُنتا رہا۔ اسے اپنی

اندرونی خوشی چھپانے میں کچھ مشکل ہو رہی تھی۔ سچ ہے: اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں ہنس ہنس کر حجام سے باتیں کرتا رہا لیکن اسے یہ تقریباً یقین تھا کہ حجام ٹھیک ہی کہے۔ مگر اس کا ججمان روپے پیسے کے معاملے میں ہمارے سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ آنکھوں کے سامنے اپنے دفینہ کا نقشہ جو پھر رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن وقتوں میں بنک اور ڈاکخانے یا لاکر کی سہولتیں کہاں ہوتی تھیں۔ یہ خال خال ہی ہوتے تھے۔ اس لیے لوگ سب کچھ زمین میں ہی دفنانا جانتے تھے۔ ایسا ہی ان بھائیوں نے بھی کر رکھا تھا کچھ تامل کے بعد حجام نے دونوں بھائیوں کو مبارکباد دی اور ہرنبس لال کے منہ میں لڈو ڈال کر اسے روک لیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے فریقین نے چار ماہ آگے شادی کی تاریخ مقرر کر لی۔ دونوں بھائیوں کو تکمیلِ خواہش پر انتہائی خوشی ہو رہی تھی۔ حجام کو خوب دے دلا کر انھوں نے ہنسی خوشی وداع کیا۔

انتہائی مسرت کی وجہ سے رام لال حجام کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ دو دن کا سفر رواں دواں تیزی سے چل کر اس نے ایک ہی دن میں طے کر لیا اور سیدھا ججمان کے گھر پہنچ کر جا مبارکباد دی۔ ساری کیفیت لڑکے کی، لڑکے کے خاندان اور ان کے کاروبار کی و نیز اپنی تصدیق کا نتیجہ ایک ایک بات کھول کر بتائی کہ کماری چمپا اور ہرنبس لال کی بڑی موزوں جوڑی بنے گی۔ شادی کی مقرر شدہ تاریخ بھی ججمان کو بتلا دی۔ امیر چند نے اپنے سارے گھر والوں کو بھی وہیں بیٹھک میں بلا لیا اور یہ خوش خبری سُنائی۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سیٹھ نے حجام کا شکریہ ادا کیا اور اس کی محنت کے لیے انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کے خاندانوں میں منگنی کے جلد ہی بعد کچھ ابتدائی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کچھ دنوں بعد امیر چند کا ایک پرانا ہم جماعت اور دوست رام پرشاد ہیر انوالہ نوامی اسے ملنے آ گیا۔ برسبیلِ تذکرہ امیر چند نے اسے بتلایا کہ بڑی تگ و دو کے بعد عزیزی چمپا کی منگنی شری ہیرا نند ساکن تلونڈی کے لڑکے ہرنبس لال سے کر دی ہے۔ شادی کی تاریخ بتلاتے ہوئے اسے شمولیت کی دعوت بھی دے دی۔ ساتھ ہی اس کی گراں قدر رائے جاننی چاہیے۔ اُسے بتلایا کہ گاؤں میں ان کی کریانہ کی بڑی اچھی دُکان ہے۔ دو بھائیوں کے گھر میں یہ اکیلا لڑکا ہے۔

اچھا کھاتا پیتا گھر ہے اور علاقہ میں ان کی بڑی مانتا اور عزت ہے۔ رام پرشاد بولا "جہاں تک میرا خیال ہے، یہ ہیرانند چودھری جوکھانند کا چھوٹا بھائی ہے۔ ان کا گاؤں میرے گاؤں سے صرف دو چار کوس بجانب شرق ہے۔ مجھ سے وہ خاندان کچھ چھپا ہوا نہیں۔ میں تو لڑکے کو بھی پہچانتا ہوں۔ لڑکا خوش قامت، خوش ادا اور شیریں سخن ہے۔ اس کا باپ ہیرانند بھی ایک سلجھا ہوا انسان ہے۔ دونوں بھائیوں کی یگانگت بھی مشہور ہے۔ مگر وہ لوگ کنجوسی میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ آپ نے کبھی سنا ہے کہ دو بھائیوں کے پاس صرف ایک جوتا ہو! باری باری یہ دونوں اسی ایک جوتے سے کام چلاتے ہیں۔ آپ تو کبھی لڑکی کی منگنی کے سلسلے میں بڑے اونچے خیالات رکھتے تھے۔ وہ کہاں گئے؟ آپ کس جگہ جا گرے؟ بطور مخلص دوست میں آپ کو شری جوکھانند آپ کے ہونے والے سمدھی کے کچھ احوال بتلادوں۔ یہ شخص بڑا اچلتا پرزہ ہے۔ جدھر سے بھی اس کو کوئی فائدہ نظر آتا ہے اُدھر ہو جاتا ہے۔ ہرگز کسرِ شان نہیں سمجھتا۔ افسروں کے اکثر آگے پیچھے ہوتا رہتا ہے۔ ڈالیاں پہنچاتا ہے۔ لوگوں کے کام کرانے میں کبھی کامیاب ہو جاتا ہے اور کبھی ناکام مگر اس کا حلوہ مانڈہ اس طرح سے چلتا رہتا ہے۔ دوستوں یاروں کو بھی دھوکہ بھی دے جاتا ہے۔ اپنی زبان کا پابند نہیں ہے اور اس میں اسے رتی بھر شرم نہیں آتی۔ عام لوگوں پر کیا محدود وہ تو اپنے گھر والوں پر بھی دھونس جمانے کی کوشش کرتا ہے۔ آخر چودھری جو ٹھہرا۔ اس نے جائیداد غیر منقولہ کافی پیدا کی ہے۔ کئی پلاٹ اس کے پاس ہیں اور اب تو وہ فیکٹری لگانے کی دھن میں ہے۔ میں نے تمھیں علاقہ کی رائے عامہ بتلادی ہے۔ ویسے خاندان بڑا شریف ہے اور وہ پرماتما کے بھی پکے بھگت ہیں۔ سادھو مہاتما کی سیوا دل و جان سے کرتے رہتے ہیں"!

رام پرشاد سب باتیں بتانے کے بعد رات وہیں ٹھہرا۔ اور اگلی صبح اپنے گاؤں چلا گیا۔ وہ رات کاشی امیر چند کے لیے عذاب کا باعث ہو گئی۔ کروٹیں بدل بدل کر اس نے رات کاٹی گویا کانٹوں کی سیج پر لیٹا ہوا ہو۔ اس انتظار میں تھا کہ کب صبح ہو اور

رام لال حجّام کو سلواتیں سناؤں۔ سویرے سویرے ہی اسے طلب کر لیا

اس وقت دنیا تو اپنے پروردگار سے لو لگائے بیٹھی تھی اور ادھر امیر چند کی آنکھیں خشم گیں تھیں۔ زبان ایک افعیٔ جانگداز سے کم نہ تھی۔ ویسے بھی عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ غصّے کے عالم میں انسان میں طبعی شرافت کا نشان تک باقی نہیں رہ جاتا۔ یہی حالات امیر چند کی ہو رہی تھی۔ ناک بھوں چڑھا کر فرطِ غضب میں اس نے حجّام پر برسنا شروع کیا۔ کہنے لگا "ابے نمک حرام! میری لاڈلی لڑکی کا رشتہ ایک قلّاش اور کنگال خاندان میں کر کے شاید تو نے مجھ سے کوئی پچھلے جنموں کا بدلہ لیا ہے۔ وہاں رشتہ کرنے کے بجائے تو کہیں بہتر ہوتا کہ تو چمپا کو کسی کنوئیں میں دھکیل دیتا۔ مجھے تو معتبر ذریعہ سے یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ دونوں بھائی مہا کنجوس ہیں۔ اور علاقے میں کنجوسی کی وجہ سے بہت بدنام ہیں۔ انھیں تو ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ کہیں گانٹھ تو نہیں کھل گئی۔ تجوریوں سے ایک پیسہ نکالنا حرام سمجھتے ہیں۔ اپنی ذات پر بھی کچھ خرچ کر کے وہ راضی نہیں ہیں۔ جگ ہنسائی ہوتی رہتی ہے، مگر وہ آنکھیں موند کر پھرتے رہتے ہیں۔ کتنی عجیب بات سنی ہے کہ ان دو بھائیوں نے صرف ایک جوتا رکھا ہوا ہے جسے وہ باری باری پہنتے ہیں۔ ایسا تو شاید تیرے گھر میں بھی نہ ہوتا ہوگا۔ ان کی اولاد بھی تو اسی طرح کی ہوگی۔ ایسے پیسے کو کیا کرنا جس سے کہ تم اپنی شان بان بھی نہ رکھ سکو۔ یہ بتا کہ تو کسی ذاتی لالچ میں آ کر تو وہاں نہیں گر پڑا؟ تو نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ تو میری شان شوکت خوب جانتا ہے۔ میں بڑے بڑے زمین داروں اور ساہوکاروں کو بھی اکثر مات کر جاتا ہوں۔ میرے خویش و اقارب سنیں گے تو کیا کہیں گے؟"

سیٹھ امیر چند کی زبان نے حجّام کے سینے کو چیر کر رکھ دیا مگر وہ بھیگی بلی کی طرح دیوار کے سہارے ایک کونے میں دبک کر کھڑا رہا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے "قہرِ درویش بر جانِ درویش" فقیر کو اگر غصہ آتا ہے تو اسے اپنی جان پر ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ امیر چند کے مقابلے پر اس بیچارے کی بساط ہی کیا تھی۔ بس کی گانٹھیں مجبوراً شربت کے گھونٹوں کی طرح پی گیا۔ اور آنسو بہ حیرت

بن کر کھڑا رہا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو سیٹھ نے جب اپنا لیکچر ختم کر لیا تو حجام نے دُزدیدہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور دبی زبان سے کہنے لگا۔" میرے آقا! میرے مہربان سیٹھ صاحب! آپ نے جو کچھ فرمایا! میں نے بغور سُن لیا۔ یہ باتیں سن کر سچ مچ میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ سب بچوں کے رشتے میں نے ہی تو کیے تھے۔ کبھی آج تک تمہیں میرے کام کی شکایت آئی ہے؟ یہ چمپا کے رشتے کا کام میں نے انتہائی دیانت داری سے کیا ہے اس سلسلے میں مجھے جگہ جگہ کی خاک چھاننی پڑی۔ بجال گروھ، جوشی جٹ، ہور تھل، گنور پھرتا پھرتا سانپلہ، جھجھر، کلانور اور بیری تک پہنچا۔ پورا ایک ماہ اسی تلاش کے کام میں سرگرداں پھرتا رہا۔ اس خاندان اور اس لڑکے کا پتہ آخر ڈیگھل سے ملا اور تلوندی پہنچ کر یہ کام سرانجام ہوا۔ اتنی باتیں کہہ کر تو آپ نے آج میری ساری محنت خاک میں ملا دی۔ آپ کی یہ باتیں معلوم ہوتا ہے کہ کسی بداندیش کے بہکاوے پر کہی ہیں۔ ایک دن تو آپ نے بھی اور میں نے بھی اپنے اصلی مالک کو منہ دکھانا ہے۔ یہ بھی اچھی طرح سُن لیجیے کہ گِڈر رخاندان ککڑ خاندان سے کسی طرح حیثیت میں کم نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور فرق ہے کہ کسی جگہ ظاہری نمود و نمائش ہے تو کہیں سادگی اور اگر یہ بھی مان لیں کہ وہ خاندان آپ کے خاندان سے کچھ کم حیثیت رکھتا ہے تو بھی قابلِ معافی ہے۔ کہتے ہیں کہ لڑکی اُس گھر دینی چاہیے جہاں اس کی عزت ہو۔ ویسے بھی خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد۔ انیس بیس کا ہی فرق ہو گا۔ صرف وقت ہی بتائے گا۔ آپ مغالطہ میں نہ رہنا اور میری بات کو مناسب موقعہ پر یاد کر لینا۔" اتنا کہتے ہی حجام وہاں سے کھسک گیا۔

کہتے ہیں کہ منہ سے نکالی ہوئی بات پرائی ہو جاتی ہے۔ شدہ شدہ یہ ساری باتیں اُن دونوں بھائیوں کے کانوں تک بھی جا پہنچیں مگر وقت کی مصلحت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ بالکل خاموش رہے کہ دیکھیں اب آگے کیا ہوتا ہے۔ ادھر کی بات سنیے جب امیر چند کا دماغی توازن اصل حالت پر آیا تو اسے خیال آیا کہ سب بزرگ کہتے چلے آئے ہیں کہ گو شادیاں سطح زمین پر ہوتی ہیں مگر ان کے فیصلے پہلے ہی آسمان پر ہو چکے ہوتے ہیں۔ نوشتہ تقدیر کو کون ٹال سکتا ہے

اس لیے اس رشتہ کو اب پایۂ تکمیل تک پہنچانا مناسب ہوگا۔ حجام نے جو بہکاوے کا اشارہ دیا تھا اس میں بھی سرِ مو کوئی غلط بات نہ تھی۔ میرے دوست رام پرشاد نے اپنے لڑکے لیے چمپا کا رشتہ ایک دو بار نہیں سہ بار مانگا تھا اور میں نے ٹال مٹول کر دی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ رشتہ قائم رکھنا ہی ٹھیک رہے گا۔ اگر دوسری طرف کوئی کمی نظر آئی تو وہ جہیز میں دے دوں گا اور دو سو روپے ماہوار وظیفہ دینا رہوں گا۔ آخر میری بھی تو اکلوتی لڑکی ہے۔ اسی وقت حجّام کو بلوایا۔ معذرت کرتے ہوئے اپنا نظرِ ثانی شدہ فیصلہ بھی تبلایا۔ اس بیچارے کی بھی جان میں جان آئی۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی کہ آخر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ دل میں یہی خیال تھا کہ اچھا ہوا سیٹھ کے من کی گرد دُھل گئی۔ بڑے آدمی سے بگاڑ کا بھی کیا فائدہ؟ رہنا پانی میں اور مگر مچھ سے بیر"

آخر شادی کا مقررہ دن نزدیک آگیا۔ اُن دنوں ایک رواج تھا کہ لڑکی کے والدین لڑکے کے والدین کو شادی سے پہلے ایک چِٹّھی جسے عرفِ عام میں ساہا چِٹّھی بولتے تھے۔ بھیجتے تھے اور اس چِٹّھی کے ساتھ کچھ روپے بھیجے جاتے تھے۔ اگر صرف ایک روپیہ بھیجا گیا ہو تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ لڑکی والوں نے بارات میں آنے والے اشخاص کی تعداد ایک سو کہی ہے۔ اگر چِٹّھی کے ساتھ دو روپے بھیجے گئے ہوں تو اس سے مراد باراتیوں کی تعداد پر دو سو کی پابندی ہوتی تھی اور اسی طرح اور آگے۔ سیٹھ امیر چند کچھ ظاہری نمائش کا دلدادہ ہونے کی وجہ سے عام دُنیا کی روش سے الگ ہی چلنا پسند کرتا تھا۔ اس لیے اس نے چِٹّھی کے ساتھ بجائے روپے بھیجنے کے خشخاش کے دانے بھیج دیے۔ پروہت جا کر گدڑ برادران کو پہنچا آیا۔ انھوں نے حسبِ دستور چِٹّھی تو اپنے سر پر رکھی مگر خشخاش کے دانوں کا آنا اُن کی سمجھ میں نہ آیا کیونکہ پہلے کبھی ایسا دیکھنے یا سُننے میں نہیں آیا تھا۔ تذبذب میں پڑ گئے۔ آخر گاؤں کے معتبرین سے صلاح مشورہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سیٹھ جی نے بارات کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ چوکھا نند نے ہیرا نند کو مشورہ بلکہ آدیش دیا کہ تم ابھی دو چار دنوں میں ان پانچ گاؤں کا چکر لگاؤ۔ ہر گاؤں کے سرپنچ کو کہنا ہے کہ گاؤں

کے سب چھوٹے بڑے بارات میں شمولیت کریں۔ اپنی اپنی بیل گاڑیوں یا رتھ میں بیٹھ کر خوب سج دھج کر آئیں۔ اگر گاؤں میں بینڈ باجے والی پارٹی ہو تو وہ اگوائی کرے بتھارے واپس آجانے پر پھر میں دوسرے پانچ دیہات کا دورہ کر کے یہی پیغام پہنچا آؤں گا۔" ہوائیوں، چرخیوں اور آتش بازی کا بھی انتظام کر دیا۔ دونوں بھائیوں نے باری باری اپنی ڈیوٹی کر لی مقصد یہ تھا کہ لڑکی والے دیکھ سکیں کہ علاقے میں ہمارا کتنا رسوخ ہے۔ اور ہم کس قدر مصارف برداشت کرنے کے قابل ہیں۔

شادی والے دن اِرد گِرد کے خاص و عام باراتی بن کر سجے ہوئے اونٹ گھوڑوں پر قرینے سے قطاریں باندھے تلونڈی پہنچے۔ ہر گاؤں کا بینڈ باجہ باراتیوں کے آگے آگے چل رہا تھا۔ دس گاؤں کا جمِ غفیر کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ہر ایک نے سوچا تھا کہ بہتی گنگا ہے، فائدہ اٹھانا چاہیے۔ گروہ کے گروہ نظر آرہے تھے۔ جدھر دیکھو ہر طرف خوشی کے راگ الاپے جا رہے تھے۔ خوش گوار پیہم صدائیں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ گانے ناچنے والے بھانڈ، مراسی انواع و اقسام کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سب کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ آتش بازی بھی کبھی کبھی چل رہی تھی۔ بھنگڑہ اور ڈانس پارٹیاں اپنے اپنے کرتب کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور وہ دونوں بھائی فرطِ مسرت سے اچھل رہے تھے۔ بارات اپنے منزلِ مقصود کا رُخ کیے ہوئے تھی، اور رواں دواں تھی۔

سیٹھ امیر چند نے سوچا تھا کہ لڑکے والے ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بارات دو ڈھائی سو سے زیادہ کیا ہو گی اور اسی اندازہ کے مطابق اس نے سارے انتظامات کیے ہوئے تھے۔ سمجھدار تھا۔ اُسے خیال آیا کہ بہتر ہو گا کہ بارات کا صحیح جائزہ لینے کی کوشش کی جاوے۔ اس نے دو معتمد دوستوں کو گھوڑوں پر سوار کرا کر اُس جانب بھیجا۔ جدھر سے بارات کی آمد متوقع تھی۔ تین چار کوس باہر نکل جانے پر انھوں نے دیکھ لیا کہ بارات بڑے ڈسپلین سے آرہی ہے۔ بینڈ باجے والے جو سب سے پہلے ملے اُن سے استفسار

کیا کہ " بارات کہاں سے آئی ہے اور کہاں جائے گی ؟" جواب ملا " تلونڈی سے آرہے ہیں۔ سیٹھ امیر چند کے گھر قادر آباد میں پہنچنا ہے۔" دونوں دوست کچھ آگے بڑھے اور یہی سوال اگلے بینڈ باجے والوں پر کرتے گئے۔ انہیں بھی وہی جواب تھا جو پہلے لے چکے تھے۔ کوئی دو کوس اور مسافت طے کرلی۔ بارات کا آخری حصہ ابھی آنکھوں سے اوجھل تھا۔ آپس میں کہنے لگے " نہ دید نہ شنید (ایسا تو پہلے کبھی نہ دیکھا نہ سنا) یہ بارات ہے یا ملٹری کا قافلہ۔" ادھر حیران ہوئے۔ فوراً گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا کر امیر چند کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ پہلے تو وہ بھی کچھ گھبرا گیا۔ مگر خاندان کا سب سے بڑا بزرگ وہاں بیٹھا تھا۔ اس نے سمجھایا۔" بیٹا گھبرانے سے کام نہیں چلے گا۔ سارا گاؤں تیرے ساتھ ہے۔ ہماری نیک خواہشات تمھارے ساتھ ہیں۔ حوصلہ سے کام لے۔ بارات کے لیے اگر بارات گھر کافی نہیں ہے تو ساتھ کے خالی میدان میں خیمے قناتیں نصب کرادو۔ کسی نے درست ہی تو کہا ہے کہ شادی کا ڈرامہ چند گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ بھی جلد مل جاتا ہے۔ پرماتما خود ایسے موقعوں پر اپنے بھگتوں کے کام بھگتانے آجاتا ہے۔ وہی ہمارا بھی سہائک ہوگا۔" بزرگ کی یہ نصیحت بڑی کارگر تھی۔ لوگوں میں جذبۂ مروت اور جذبۂ ہمدردی بدرجۂ غائت تھا۔ پھر کیا تھا، ہر ایک شخص دوسروں پر سبقت لینے کی غرض سے تن من سے کام میں جٹا ہوا تھا۔ اُن لوگوں میں پورا اتفاق تھا اور اتفاق میں برکت ہے۔ باہمی ہمدردی اُن کا ہتھیار تھا۔ گاؤں کی کوئی بھی لڑکی ہو وہ ایک مشترکہ عزت سمجھی جاتی تھی۔ امیر چند کو لوگ اپنا مربی تصور کرتے تھے۔ اُس کا حسنِ سلوک اس آڑے وقت بڑے کام آیا۔ بارات کو رواج کے مطابق دو راتیں ٹھہرایا گیا۔ اُن کی خاطر تواضع اور دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ہر کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام پا گیا۔ ڈولی کے الوداع کرنے سے پہلے امیر چند نے چوہدری صاحبان کی فرودگاہ پر اپنے پروہت کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ آپ لوگ آکر جہیز دیکھ لیں اور اسے اپنی نگرانی میں بند کروالیں۔ پیغام ملنے پر دونوں بھائیوں نے کچھ دیر آپس میں صلاح مشورہ کرکے اُسی پروہت کے ہاتھ جواب بھیج دیا کہ ہم تقریباً ایک گھنٹہ ٹھہر کر آسکیں گے۔

ادھر اب یہ دونوں بھائی ایک نئی قسم کا ڈرامہ کرنے جا رہے ہیں جس کا منصوبہ انھوں نے امیر چند کو نیچا دکھانے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ دس گاؤں کے ایک ایک، دو دو مکھیہ جلدی جلدی سے بلائے اور انھیں یوں خطاب کیا: "آپ صاحبان نے مع اپنے ساتھیوں کے ہربنس لال کی بارات میں شمولیت کر کے ہمیں عزت بخشی ہے۔ اس کا بہت بہت شکریہ۔ اب ایک معاملے میں آپ کی صلاح کی اشد ضرورت آپڑی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم سیٹھ کے دیے ہوئے جہیز کو یہیں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ اپنے گھر نہیں لے جانا چاہتے۔ اس لیے ہم نے یہ طریقہ سوچا ہے کہ ہربنس لال سارا جہیز اپنے پروہت کو دان کر دے۔ پروہت اسے حجام کو دے دے۔ اسی طرح حجام دان لینے کے بعد جھیور کو دے دے۔ آخر میں جھیور جمعدار کو دے دے اور جمعدار سارے سامان کو موقعہ پر ہی غریب غربا کو دان کر دے۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ لاگی اس طرح سے اپنے اپنے حق سے کسی طرح محروم رہ جائیں گے۔ ہم پنچایت سے جہیز کا مول لگوا کر ہر ایک لاگی کو پوری پوری رقم موقعہ پر ادا کر دیں گے۔ کرپا کر کے اپنی اپنی مفید رائے سے مطلع فرمائیے۔ اُدھر دیر ہو رہی ہے سیٹھ نے جہیز دیکھنے اور سنبھالنے کے لیے بلایا ہے۔" لوگ تو چودھری صاحبان کے بن داموں غلام بن چکے تھے۔ ان کے حسنِ سلوک کا ہر دل پر سکہ بیٹھ چکا تھا۔ ایسا نادر موقعہ بھلا پہلے کب آیا تھا۔ وہ فخر محسوس کر رہے تھے کہ ہماری صلاح کے بغیر یہ بھائی ایک قدم بھی نہیں اٹھاتے۔ ایک مکھیہ بولا: "گدڑ صاحبان! ہم ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہیں مگر یہ تو سمجھا دیجیے کہ ایسا قدم اٹھانے کی آخر وجہ کیا ہے؟" چوکھانند قدرے تلخ مزاج تھا۔ کبھی کبھی ایسی لغو باتیں کہہ جاتا تھا، جن کا اکثر دائرۂ احباب پر برا اثر پڑتا تھا۔ اور وہ اس سے پیچھے ہٹ جانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ میرانند عمر میں چھوٹا تھا۔ لوگ اسے "گھی کا گھڑا" کہا کرتے تھے۔ بڑے شیتل سبھاؤ کا تھا۔ لہٰذا آج کا کام اسی نے سنبھالا۔ جب وہ بولنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگوں نے پُرزور تالیاں بجائیں۔ "گدڑ خاندان زندہ باد، پائندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے سارا گاؤں گونج اٹھا۔ ان تالیوں اور نعروں کی آواز امیر چند کی کوٹھی تک جا پہنچی۔ اس نے یوں گوہر افشانی کی۔ "میرے بھائیو اور بزرگو! جب ہربنس لال کا رشتہ سیٹھ جی کی لڑکی کے ساتھ سر انجام پا گیا، تو کسی

بھڑکانے والے نے اُن کے کان بھر دیے کہ ہم لوگ اس کے پاسنگ بھی نہیں۔ اور ہمارا رہن سہن اُس کے سٹینڈرڈ سے بہت نیچا ہے۔ وہ تو رشتہ توڑنے کی بھی سوچ میں تھا۔ اسے اپنی امارت کا بڑا زعم ہے۔ ہمیں تو آپ سب لوگ خوب جانتے ہی ہیں۔ ہم دونوں بھائی نمود و نمائش کی زندگی میں یقین نہیں رکھتے۔ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ کوئی گناہ تو نہیں ہے؟ پرماتما کی ہمارے اوپر اپار کرپا ہے۔ آج ہم مجبوری میں آکر یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ان سب لاگیوں کے بھگتان کے بعد بھی اتنا اثاثہ بچ رہے گا کہ ہربنس لال کے پتر اور پوتے بھی عیش کی زندگی بسر کر سکیں گے۔" اس کی جادو بیانی اپنا کام کر گئی۔ مکھیہ کہنے پر مجبور ہو گئے "چودھری صاحبان، ہمیں آپ کی ہر بات سے صداقت کی بو آتی ہے۔ آپکے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ ہم لوگ تو آپ کی سادہ زندگی و رہن سہن کو پسند کرتے ہیں۔ سادگی اور اچھے خیالات نمائشی زندگی سے کہیں بہتر ہیں۔ اگر آپکے سمدھی امیر چند نے آپ لوگوں کے متعلق کچھ غلط سوچا تھا تو یہ بے حرمتی صرف آپ کی ذات کی نہ تھی۔ اس سے ہم لوگوں کا بھی گہرا سمبندھ ہے۔ اب ہم آپ کی رائے سے بالکل متفق ہیں۔ اور آپنے جو کچھ سوچا ہے بالکل بجا ہے۔" لوگوں نے پھر چوکھا نند زندہ باد، ہیرا نند زندہ باد کے نعرے لگائے اور اب بارات سیٹھ امیر چند کی جائے رہائش پر جا پہنچی۔ اُس وقت کے رواج کے مطابق جہیز پھیلا کر رکھا ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں نے اس سے ایک ایک کپڑا اٹھایا اور اپنے سر پر رکھ لیا مقصد لڑکی کے باپ کی عزت تھی۔ چوکھا نند نے خاطر تواضع، جہیز کے مال کے لیے شکریہ ادا کیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اب ہربنس لال سیٹھ جی کی طرف منہ کر کے پوچھنے لگا۔

"پوجیہ پتا جی! آپ ذرا بتلانے کی کرپا کریں گے کہ یہ جو جہیز ہے اب یہ کس کی ملکیت ہے۔ اور آپ کو اس کے مصرف کے متعلق کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟" امیر چند کہنے لگا "بیٹا یہ جہیز میں نے تو آپ کو پیش کر دیا ہے۔ آپ کی ملکیت ہے اور آپ اسے جس طرح چاہیں مصرف میں لائیں میرے اعتراض کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" یہ جواب پا کر ہربنس لال نے اپنے پروہت کو بلایا اور اسے یوں کہنے لگا "پروہت جی! ہم یہ سارا سامان جہیز کا آپ کو دان کرتے ہیں۔ آپ

اپنی مرضی سے اب جہاں چاہیں لے جائیں۔" پروہت نے نئے جوڑے کو دعائے عمر درازی دی اور دان قبول کر لیا۔ پروہت نے اپنے گاؤں کے حجام موجود الوقت کو بلایا، اور جہیز جوں کا توں اسے دان کر دیا۔ حجام نے دان لے کر جھیور کو بلایا اور وہ سامان اسے دان دے دیا۔ حسبِ ہدایت جھیور نے جمعدار کو وہ دان دے دیا۔ جمعدار نے اپنی ڈیوٹی کرتے ہوئے سارا مال وہیں کھڑے کھڑے غریبوں کو تقسیم کر دیا۔ یہ ساری کاروائی سیٹھ کی موجودگی میں ہو رہی تھی مگر اس نے اُف تک نہ کی۔ ایک بے بس انسان کی طرح جس کے منہ میں زبان نہ ہو۔ اس بیچارے کی مٹی خوار ہو رہی تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ اس عالمِ حیرت میں اسے اپنی آنکھوں پر بھی اب یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ ایک حقیقت ہے یا خواب۔ یہ نظارہ اس کے لیے ایک معمہ سے کم نہ تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس قدر ذلت برداشت کرنے سے تو زمین میں گڑ جانا کہیں بہتر ہے۔ اقتضائے حالات کے مطابق گم سُم کھڑا رہا۔ موقعہ ہی ایسا تھا۔ ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے کا نہ جانے کتنا خوف نتیجہ نکلتا۔ گڈر برادران بڑے قیافہ شناس تھے۔ انھوں نے سیٹھ کے نظریے سے بھانپ لیا تھا کہ اس کی اندرونی حالت کیا ہے۔ بڑے ادب سے اسے کہنے لگے "ٹکڑ صاحب! آپ چپ چپ کھڑے ہیں۔ کیا بات ہے؟ آپ کو آج بڑا ہی خوش ہونا چاہیے تھا کہ ایک تو آپ اپنی ایک بڑی ذمہ داری سے سبکدوش ہو رہے ہیں اور دوسرا اس جوڑے نے آج پہلی دفعہ اپنے ہاتھوں سے دان دیا ہے۔ آپ انھیں آشیرواد دیں کہ یہ جوڑا آگے بھی اسی طرح دان پُن کرتا رہے۔ کماری چپا اب ہمارے گھر کی بہو ہی نہیں مالکہ بن چکی ہے۔ اسے نئے گھر میں پورا چاؤ پیار ملے گا۔ اس کے آرام کے لیے ہم نے ہر طرح کا بڑھیا سے بڑھیا سامان اس کے سٹینڈرڈ کے مطابق پہلے ہی بندوبست کر دیا ہے۔۔ ہاں، ابھی تھوڑا سا کام بقایا رہ گیا ہے۔ جہیز کی قیمت ہماری پنچایت نے تشخیص کر دی ہے وہ ابھی آپ لوگوں کے سامنے ہر ایک لاگی کو ادا کر دی جائے گی تا کہ کسی کا گلہ نہ رہے۔" یہ کہتے کہتے اُن دونوں بھائیوں نے مبلغات کی بھری ہوئی بوریوں کے منہ کھول دیے اور اس طرح ہر لاگی کی واجب الادا رقم

موقعہ پر ہی دے دی۔ سب لوگ، غریب غربا اور تمام برادری اور باراتی اپنی اپنی جگہ پر خوش
تھے اور بغلیں بجا رہے تھے کہ ایسی چیز تو آج تک کبھی روئے زمین پر دیکھنے میں نہیں آئی۔ موجود
اشخاص میں چند لوگ مغموم بھی تھے۔ وہ کون تھے؟ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ ایک تو سیٹھ
امیر چند لکھڑ اور دوسرا تھا، اُس کا دوست اور پُرانا ہم جماعت رام پرشاد۔ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ
پر شرمندہ ہو رہے تھے کہ ہم نے سنا کیا تھا، سوچا کیا تھا اور یہ نکلا کیا۔ یونہی کسی کے کہے سنے پر
اعتبار کر لینا کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ رام لال حجام بھی کہیں چھپ کر یہ ساری کارروائی
شروع سے آخر تک دیکھ رہا تھا۔ اُس سے رہا نہ گیا تو سر بلند کر کے اس نے پہلے تو سیٹھ جی کو اور
پھر اس کے دوست رام پرشاد کو "نمستے" بُلائی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ یہ ساری شرارت اسی رام
پرشاد کی تھی اور اسی شاطر کے بہکاوے پر مجھے جھاڑ پڑی تھی۔ سیٹھ کو یاد دہانی کرا دی کہ "میں نے
کہہ دیا تھا کہ لکھڑ خاندان سے گڈر خاندان کم صاحبِ حیثیت نہیں ہے۔ آج وقت نے پورا ثبوت
مہیا کر دیا۔" سیٹھ امیر چند نے اُن دونوں بھائیوں سے ہاتھ جوڑ کر اپنی غلط فہمی کے لیے معافی مانگی۔
لڑکی کو وداع کرتے وقت گھر کی عورتوں اور رشتہ داروں نے حسبِ معمول شکشا دی۔ سیٹھ نے صرف
اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا: "سپردم بتو مایۂ خویش را۔ تو دانی حسابِ کم و بیش را۔" میں نے تو
اپنا سرمایہ اب تمہارے سپرد کر دیا ہے۔ اب کمی بیشی آپ ہی جانیں۔ چوکھا نند جی نے اس شادی
کے بعد پینترا بدلا۔ سرِ دست اس کی تفصیل کسی اور موقعہ کے لیے اٹھا رکھی گئی ہے تاکہ مزید طوالت آپ
کی طبعِ نازک پر گراں نہ گذرے اور سودا کے شعر پر یہ کہانی ختم کی جاتی ہے:

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

○

ایک کنجوس سیٹھ کی کہانی

(مزاحیہ)

کسی وقت پانی پت شہر (ہریانہ پرانت) میں ایک ساہوکار مسمی بخیلی رام رہا کرتا تھا۔ طبعاً وہ صلح پسند سب سے میل ملاپ رکھنے والا اور دوسروں کا بہی خواہ تھا، مگر اس کی کنجوسی زبان زدِ خاص و عام تھی۔ اسے ہر وقت صرف روپیہ پیسہ اکٹھا کرنے کی ہی دُھن لگی رہتی۔ دُھن کا پُر فریب پاپی رُوپ بھوت ہر وقت ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا رہتا۔ دن ہو یا رات دماغ پر یہی خیال مسلط رہتا کہ کہیں گانٹھ تو نہیں کھل گئی کہیں دھن تھوڑا تو نہیں ہو گیا۔ ہر وقت دولت کی تمنا میں ہی پھنسا رہتا۔ اس کی زندگی کا تو زرین اصول یہ تھا کہ کوڑیوں کی تم فکر کر لو، روپے اپنی فکر آپ ہی کر لیں گے۔ گویا کوڑیوں کو بھی دانت سے پکڑنا اس کا نصب العین تھا۔ اتفاق سے بخیلی رام کی بیوی لاجونتی بھی اس کے نقشِ قدم پر چلنے والی تھی۔ یک نہ شد دو شد۔ دونوں کا سبھاؤ ایک جیسا تھا۔ ان کا ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام تھا ہر بنس لال۔ وہ کرنال میں کسی فیکٹری میں معمولی پوزیشن پر نوکر تھا مشاہرہ زیادہ نہ تھا، مگر بخیلی رام اور اس کی بیوی سال کا زیادہ حصہ اسی لڑکے کے پاس گزارتے تھے۔ مقصد تو اپنی بچت کا تھا اور کہتے یہ تھے کہ بچوں پر بوجھ شروع ہی سے ڈالنا چاہیے نہیں تو بڑے ہو کر وہ باغی ہو جاتے ہیں اور ماں باپ کی خدمت سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اسی طرح کا وطیرہ ان کا پُرانے دوستوں یاروں سے تھا۔ خود تو دوسروں کے گھروں میں جانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے مگر کبھی کوئی دوست یار ان کے گھر آ نکلے تو اس طرح خاموش ہو جاتے گویا سانپ

سونگھ گیا ہو۔ صرف سادہ پانی سے ہی تواضع کر دیتے۔ گھر آئے مہمان کے لیے پیسہ خرچ کرنا حرام تھا۔ بخیلی رام کے دوست اکثر اس کے سامنے گاہے گاہے خیرات کا مسئلہ چھیڑتے رہتے۔ ایک دن ایک سبھا میں یہ سب بیٹھے تھے تو ایک دوست نے جان بوجھ کر سنت کبیر کے اس شعر کی طرف اس کی توجہ دلائی:

چڑی چونچ بھر لے گئی ندی نہ گھٹیو نیر
دان دیے دھن نہ گھٹے کہہ گئے سنت کبیر

(اگر چڑیا کسی بہتی ندی سے چونچ بھر پانی لے جاتی ہے تو ندی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح اگر ایک انسان اپنی آمدنی سے کچھ خیرات دیتا ہے تو ندی کی طرح اسے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا) مگر بخیلی رام کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اس نے فی البدیہہ جواب دیا "دوستو! کئی کام میں کرتا ہوں جو آپ لوگ نہیں کرتے۔ یہ خیرات کا کام آپ ہی کر لیا کرو اور ساتھ ہی یہ شعر کہہ دیا:

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں
پیسہ اپنے پاس کہاں

پنچوں کا کہنا سر ماتھے پر، پرنالہ وہیں کا وہیں والی بات ہے۔ وہ اپنے فیصلے سے کبھی ٹس سے مس نہ ہوتا۔ ایسے ہی موقع کے لیے شاید بھرتری ہری نے فرمایا تھا:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

غرضیکہ بخل نے شریمان بخیلی رام جی کی خوش اخلاقی، خوش گفتاری اور سلیقہ مندی جیسی تمام عمدہ صفات پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ بخل کالے رنگ کا ہوتا ہے جس پر کوئی رنگ بھی خواہ وہ کتنا ہی شوخ کیوں نہ ہو، نہیں چڑھ سکتا۔ اور بخیل انسان کے دشمن خواہ مخواہ پیدا ہو جاتے

ہیں. بخیلی رام شاہ کے دوست بھی بڑے چست تھے. یہ دیکھ کر کہ ہمارا رفیق خیرات اور دان کی طرف مشکل سے ہی دھیان دے گا انھوں نے سوچ بچار کر کے ایک نیا طریقہ نکالا کہ کسی نہ کسی طرح ترغیب دے کرا سے ہردوار یا کسی دیگر دھرم استھان پر بھیجا جائے خواہ اپنی جیب سے بھی کچھ خرچ کرنا پڑے. وہ خوب جانتے تھے کہ یاترا پر تو پانڈے اور فقیر اس کی جیب ہلکی کر کے ہی دم لیں گے. شاہ بھی ان کے چکمے میں آ گیا مگر کہنے لگا "میں پہلے تو کبھی تیرتھوں پر گیا نہیں. اب آپ کے کہنے پر ہاں کر دی ہے زندگی ناپائیدار کا کوئی بھروسہ نہیں. دل میں یہ حسرت کیوں رہ جائے نیز آپ جانتے ہیں میں بوڑھا آدمی ہوں. بستر خود اٹھانا مشکل ہے اس لیے اس کا مناسب انتظام آپ کر دیں. ہر کوئی جانتا ہے کہ اگر پیدل تیرتھ یاترا کی جائے تو ثواب زیادہ ہوتا ہے. اس لیے ہم پاپیادہ ہی جائیں گے. ہاں تو ساتھی کو یہ پہلے ہی سمجھا دینا کہ رات کو وہ الگ ٹھکانے پر ٹھہرے گا اور اپنا کھانا بھی الگ کھائے گا. غرضیکہ وہ میرے اوپر کسی طرح سے بھی کوئی بوجھ نہیں ڈالے گا." دوستوں نے موقعہ غنیمت جانا، فوراً گاؤں کے حجام چھجو کے پاس گئے. وہ بھی اپنے دل میں عرصہ سے تیرتھ یاترا کا شوق رکھتا تھا. دوستوں نے چندہ اکٹھا کیا اور حجام کو بخیلی شاہ کے ساتھ تیرتھ یاترا پر جانے کے لیے تیار کر لیا. بخیلی رام کی رکھی ہوئی سب شرطیں بھی اسے صاف شبدوں میں سمجھا دی گئیں جنھیں اس نے قبول کر لیا مگر اس نے بھی اپنی ایک شرط رکھ دی "بخیلی رام سے جب بھی اور جہاں بھی میں کوئی سوال پوچھوں گا تو بخیلی رام پابند ہو گا کہ وہ میرے سوال کا موقع پر ہی جواب دے گا نہیں تو میں اس کا بستر وہیں چھوڑ کر اپنے گھر واپس آ جاؤں گا. میں نے آخر گاؤں میں ہی رہنا ہے، مجھے بعد میں گلہ نہ دینا." بخیلی رام نے بخوشی یہ شرط مان لی چنانچہ اچھی ساعت دیکھ کر بخیلی رام اور حجام کو تیرتھ یاترا پر روانہ کر دیا گیا. بخیلی رام کا بستر حجام نے سر پر رکھ لیا. بخیلی رام شروع سے ہی تمباکو کا شوقین تھا. اس نے اپنے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا حقہ لے رکھا تھا. کبھی کبھی کش لگا لیتا. سگریٹ اور بیڑی کا استعمال وہ فضول خرچی سمجھتا تھا.

وہ چلتے چلتے دوپہر کے وقت ایک کنوئیں کے پاس پہنچے. وہاں ایک درخت کی گھنی چھاؤں دیکھی تو ستانے اور کھانا کھانے کے لیے انھوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیے. تھوڑی دیر کے بعد

پھر چل پڑے اور ایک شہر جا پہنچے۔ بخیلی رام نے اِدھر اُدھر سے دریافت کیا اور ایک ایسی دھرم شالہ کا پتہ لگایا۔ جہاں رات بسر کرنے کے لیے کچھ نہ دینا پڑے۔ رواں دواں اُس دھرم شالہ پر جا پہنچے۔ چوکیدار نے پوچھا: "صاحب! آپ کو کتنی چارپائیوں کی ضرورت ہے؟ چارپائی کا کرایہ معمولی چار آنے ہے۔" بخیلی رام نے نہ کر دی۔ ساتھ کے ڈھابے پر دونوں نے اپنا اپنا کھانا کھالیا۔ حجام نے بخیلی رام کی ہدایت کے مطابق اُس کا بستره فرش پر کر دیا۔ اور خود اسی کمرے کے سامنے ایک خالی برآمدہ دیکھ کر وہاں چلا گیا۔ اپنی چادر بچھائی اور کمبل لے کر سو گیا۔ کوئی دو گھنٹے ہی گذرے ہوں گے کہ اُس برآمدے میں ایک سانڈ آنکلا۔ یہ اس کی خواب گاہ تھی۔ چھجّو پر بڑا خوف طاری ہوا۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ جلدی سے اپنی چادر کھینچی۔ دَوڑ کر سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اور اسی برآمدے کی چھت پر جا کر دراز ہو گیا۔ سردی اور سانڈ کی دہشت کی وجہ سے اب نیند حرام ہو چکی تھی۔ چھت کے سامنے ایک بڑی اونچی عمارت تھی جس کے اندر سے فانوس جیسی تیز روشنی باہر نکل رہی تھی اور اس طرح سے کھڑکی میں ہی فرش پر بیٹھی ہوئی ایک عورت نمایاں طور پر نظر آرہی تھی، جو ہاتھ کی انگلیوں سے لگاتار زمین کریدنے میں مصروف تھی۔ وہ عورت ساری رات اسی کام میں لگی رہی بڑی بیکل معلوم ہوتی تھی۔ ساری رات نہ تو چھجّو سو سکا نہ وہ عورت سو سکی۔ چھجّو کو بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ دُنیا میں شاید ہم ہی دو ایسے بدنصیب ہیں جو نیند کی لذّت سے بالکل محروم ہیں۔ ایسے وقت میں جب کہ بہتے دریا تھم جاتے ہیں اور جب ہر چھوٹا بڑا حتیٰ کہ وہ بچّہ بھی جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہے، نیند کی لپیٹ میں آجاتا ہے، تو ہم دو کے ساتھ قدرت نے اتنی بڑی ناانصافی کیوں کی ہے؟ آخر کچھ وجہ تو ہوگی۔ اپنی ذات کے متعلّق تو وہ خوب جانتا تھا، مگر اس عورت کا جاگنا اور زمین کریدنا اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ عقل نے یاری نہ کی جتنا بھی سوچا سب بیکار۔ آخر ہار کر کہنے لگا کہ "اچھا صبح کے وقت میں اپنے رفیق اور ہمدم سیٹھ بخیلی رام سے پوچھوں گا۔" جوں توں رات کاٹی۔ ایک ایک پل برسوں کی طرح کٹا۔ گویا پہاڑ سی رات اس طرح کاٹی جیسے کوئی کانٹوں کی سیج پر لیٹا رہا ہو۔ نیند نہ آنی تھی، نہ آئی۔

ابھی اندھیرا ہی تھا۔ جھجو لالہ جی کے کمرے کے باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ بخیلی رام اس وقت اپنے پروردگار سے لَو لگائے بیٹھا تھا۔ جب پوجا پاٹھ سے فارغ ہو گیا تو جھجو نے لالہ جی کا بستر لپیٹا۔ سر پر رکھا اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ جب دو چار کوس شہر سے باہر نکل گئے تو جھجو نے یوں بات چلائی۔

"لالہ جی! رات میرے برآمدے میں ایک سانڈا نکلا۔ میں دہشت سے بھاگ کر سیڑھیوں پر چلا گیا اور وہاں سے برآمدے کی چھت پر پہنچا۔ سردی لگ رہی تھی۔ رات نیند نہ آئی۔ بڑی بے چینی رہی۔ ایک اور ایسا نظارہ دیکھا جس نے اور بھی بے چین کر دیا۔" سیٹھ بخیلی رام کہنے لگا۔ "بھائی جھجو راجہ! تو نے بڑی غلطی کی جو سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ میرے کمرے میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے آجاتا۔ مجھے سن کر بڑا افسوس ہو رہا ہے کہ میرا سفر کا ساتھی اس طرح عذاب میں رہا۔ اور میں میٹھی نیند سوتا رہا۔ اچھا تو وہ نظارہ کیا تھا؟ کچھ میں بھی تو سنوں۔ آخر سفر میں اگر ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے شریک نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا؟"

جھجو لالہ جی کی طرف سے اس قدر ہمدردی کے الفاظ سننے کے بعد کہنے لگا۔ "لالہ جی! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ سامنے ایک بڑی عمارت تھی جس میں سے بڑی ہی تیز روشنی نکل رہی تھی۔ اس کے فرش پر بیٹھی ہوئی ایک عورت نظر آ رہی تھی۔ وہ عورت ساری رات اپنی انگلیوں سے زمین کریدتی رہی۔ اس نے رات بھر صرف زمین کریدنے کا کام کیا۔ کیا مجال کہ ایک پل بھی آرام کیا ہو۔ میں بھی جاگتا رہا اور وہ بھی جاگتی رہی۔ اب آپ مجھے کرپا کر کے یہ بتلائیں کہ وہ عورت ساری رات کیوں جاگتی رہی اور زمین کیوں کریدتی رہی؟ آپ تو پنچایت کے پردھان رہ چکے ہیں۔ بڑے بڑے مسئلے طے کرتے رہے ہیں۔ میں تو محض ان پڑھ ہوں۔ میری عقل تو جواب دے گئی ہے۔ آپ ہی اس گتھی کو سلجھا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی آپ کو اپنا دیا ہوا وعدہ یاد دلا دوں کہ آپ میرے سوال کا جواب موقع پر دینے کے پابند بھی ہیں۔"

بخیلی رام بولا۔ "بھائی! ذرا یہ تو سوچ کہ میں نے تیرے سونے کی جگہ نہیں دیکھی۔ وہ عمارت جس میں عورت لگاتار زمین کریدتی رہی وہ بھی نہیں دیکھی۔ وہ عورت اور اس کا زمین کریدنا بھی نہیں دیکھا، پھر تم مجھ سے یہ توقع کرتے ہو کہ میں تمھیں وجہ بتلاؤں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تفتیش حالات کے لیے موقع دیکھنا اشد ضروری ہوتا ہے۔ تم نے سوال اس وقت کیا ہے جب ہم موقع سے اتنی دور آ گئے ہیں۔"

حجام بھی سمجھ دار تھا۔ لالہ جی کے بشرے سے اس نے بھانپ لیا کہ لالہ جی اپنی بات سے منحرف ہو رہا ہے۔ تبھی اِدھر اُدھر کے بہانے لگا رہا ہے۔ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔ اس کے چہرے پر تھوڑی سی مصنوعی خفگی کے آثار نظر آنے لگے۔ لالہ جی کو کہنے لگا۔ "لالہ جی! آپ تو اکثر کہا کرتے ہیں کہ آپ نے زندگی میں ناخنِ تدبیر سے بڑے بڑے پیچ دار معاملات کا حل نکالا تھا۔ میرا سوال تو بڑا معمولی ہے۔ آپ جواب دینے میں خواہ مخواہ لیت و لعل کر رہے ہیں۔ اس طرح سے تو کام نہیں چلے گا۔ میں واپس اپنے گھر جا رہا ہوں۔ اگر اپنے گھر کوئی پیغام بھیجنا ہے تو دے دیجیے۔ میں پھر کبھی کسی اور ججمان کے ساتھ تیرتھ یاترا کر لوں گا۔" یہ کہتے کہتے وہیں جنگل میں لالہ جی کا بستر زمین پر پھینک دیا جہاں کوئی قلی، مزدور بستر اٹھانے والا نہ مل سکے۔ لالہ بخیلی رام نے خوب سمجھ لیا کہ حالات بگڑ رہے ہیں۔ بستر کون اٹھائے گا اور اکیلا کدھر کو جاؤں گا۔ گاؤں میں بھی لعن طعن ہوگی۔ خوشامدانہ لہجے میں حجام کو کہنے لگا۔ "بھائی ججو رام! تو تھوڑی سی بات سے اتنا برہم ہو گیا ہے۔ ایک مقولہ ہے کہ اگر کسی کے ساتھ یاری لگائی جائے تو اسے آخر دم تک نبھانا چاہیے۔ ذرا سوچ اگر تو اکیلا گاؤں واپس جاتا ہے تو صرف مجھ ایک پر نہیں بلکہ ہم دونوں پر جگ ہنسائی ہوگی اور ہم دونوں مذاق کا مضمون بنیں گے اور تیرتھ یاترا دھری کی دھری رہ جائے گی۔ تیرا سوال کچھ مشکل نہیں ہے کہ میں جواب دے سکوں۔ اس سے بھی مشکل متعدد سوالات میں حل کر چکا ہوں۔ تو گھبراہٹ نہ کر۔ میرا بستر نہ اٹھا۔ میری چلم بھر کر لے آ۔ مجھے دو کش لگانے دے۔ میری عقل ٹھکانے پر آ جائے گی۔ تب جواب دے سکوں گا۔" بخیلی رام الغرض المجنون (جس کو کوئی بھی غرض ہوتی ہے، وہ دیوانہ ہوتا ہے) کا ثبوت بہم پہنچا رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نادان کی دوستی اور جی کا زیاں ایک مانی ہوئی ہے۔ اس نے دو کش لگا لیے تو فرضی کہانی اختراع کی اور حجام کو یوں سنانی شروع کی۔ دروغ بر گردنِ راوی۔

"اس شہر میں کسی وقت ایک متموّل آدمی دولت رام رہا کرتا تھا۔ بے اولاد تھا۔ قدرت دیکھیے کہ جب وہ پچاس سال کا ہوا پرماتما نے اسے ایک چاند سا لڑکا دیا۔ بہت خوشیاں منائی گئیں اور کئی دن لنگر چلتا رہا۔ جوتشی بلائے گئے۔ انھوں نے لڑکے کا نام سورج مل تجویز کیا کیوں کہ اس کی پیدائش کے وقت سورج برجِ حمل سے نکل کر برجِ سرطان میں داخل ہو رہا تھا۔ دولت رام کو کئی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا۔ جوں جوں عمر بڑھ رہی تھی،

توں توں بوڑھے ساہوکار اور شمشان کے درمیان فاصلہ کم سے کمتر ہو رہا تھا ، پیری وصد عیب (بڑھاپے کے ساتھ کئی تکلیفیں آجاتی ہیں) کا ہمیشہ ماتم کیا جاتا رہا ہے جسمانی و دماغی قوتیں آہستہ آہستہ جواب دینے لگیں، چال لڑکھڑانے لگی۔ لہذا دولت رام نے جلدی جلدی اپنے نور چشم سورج مل کی شادی کردی۔ لڑکے کی عمر شادی کے وقت صرف دس بارہ سال تھی۔ ان دنوں چھوٹی عمر میں شادی کا عام رواج تھا۔ دولت رام قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے تھا، دن بدن طبیعت اب کمزور ہوتی جارہی تھی، اکلوتے لڑکے کی شادی خانہ آبادی کا اسے بڑا چاؤ اور شوق تھا کہ کہیں دل میں یہ حسرت نہ رہ جائے۔ سورج مل کی شادی تو ہوگئی مگر ابھی وہ سن تمیز کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ دولت رام راہی ملک عدم ہوا۔ اب لڑکا بیچارا اکیلا رہ گیا تھا۔ سیٹھ کی بیوی نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ کاروبار کی غور پرداخت کون کرے؟ سب رشتہ داروں نے آنکھیں پھیر لیں۔ نوکروں چاکروں کو بھی صرف اپنے حلوے مانڈے سے کام رہ گیا۔ مال غنیمت سمجھ کر سب گل چھرے اڑانے لگے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ سیٹھ کے زمانے کی جاہ و ثروت سب ختم ہوگئی۔ کسی نے سچ کہا ہے: سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں۔ اب ماضی کی صرف حسین یادیں ہی باقی رہ گئیں۔ سیٹھ جی کے دوست یار جو ہر وقت سیٹھ کی کوٹھی پر ناؤ نوش کیا کرتے تھے۔ ضیافتیں اڑایا کرتے تھے۔ اب آنکھ بچا کر نکل جاتے بلکہ انھوں نے اس محلے سے گذرنا ہی موقوف کردیا۔ مصیبت کے وقت کون ساتھ دیتا ہے؟ تنگی کے دن آگئے۔ گھر کا روزمرہ کا معمولی خرچ بھی برداشت کرنے کی جب طاقت نہ رہی تو سورج مل نے پکا ارادہ کرلیا کہ اب کسی اور شہر چل کر گذر اوقات کرنی چاہیے۔ وہاں خواہ ٹوکری ہی اٹھانی پڑے۔ اپنے آبائی شہر میں تو ایسا کرنا باعث توہین تھا۔ اس کی بیوی ابھی اپنے میکے میں ہی تھی۔ رواج کے مطابق ان دنوں مکلاوہ شادی کے کئی سال بعد لایا کرتے تھے۔ چلتے چلتے وہ فیض آباد پہنچا۔ تانگہ اڈہ پر کھڑا رہتا۔ مسافر و کلا سامان پہنچا دیتا۔ آٹھ دس آنے کی روزانہ یافت ہوجاتی۔ کچھ خود کھا پی لیتا۔ کچھ دنوں کے بعد جو بچت ہوجاتی اسے اپنی ماں کے پاس بھیج دیتا۔ یہ اس کا معمول بن گیا تھا۔

ایک دن شام کے وقت ایک خوش پوشش بزرگ مسافر تانگہ اڈہ پر اترا۔ اس کے پاس

کچھ سامان تھا۔ سورج مل نے محلہ بوگھڑاں میں اس کا سامان پہنچا دیا اسے وہاں سے ایک روپیہ چہرہ شاہی مزدوری ملی کچھ کھا پی لینے کے بعد اس نے اپنے سر سے چادر اُتاری۔ اسی مکان کے سامنے سورج مل ایک خالی کھڑکی دیکھ کر وہیں لیٹ گیا۔ رات کے دس بجے کا عمل ہوگا کہ اُسی مکان سے ایک نوجوان لڑکی ہاتھ میں لالٹین لیے نکلی اور اس نے "مزدور، مزدور" کی آواز لگائی۔ سورج مل بھاگتا ہوا آیا، تو وہ لڑکی کہنے لگی۔ "قلی! تو مجھے محلہ راجپوتاں لے چل۔ دو آنے مزدوری دوں گی اور اگر تجھے وہاں انتظار کرنا پڑے تو دو آنے واپسی کے بھی دے دوں گی۔" سرجا (جو سورج مل کا عرفِ عام تھا) لڑکی کو منزلِ مقصود پر پہنچا کر حسب ہدایت انتظار کرتا رہا۔ وہ لڑکی دو گھنٹے کے بعد باہر نکلی۔ سرجا چشم براہ تھا۔ اُس نے لالٹین ہاتھ میں پکڑی اور لڑکی کو اُسی جگہ پہنچا دیا جہاں سے وہ گئی تھی۔ شومیِ قسمت سے لڑکی نے سرجا کو اُجرت دینے کی بجائے گالیاں دیں۔ اس غریب نے تقاضا کیا تو لڑکی نے اس کے منہ پر ایک چپت لگا دی اور جلدی سے اندر سے کنڈی لگا لی۔ سرجا رونے لگا: قہرِ درویش برجانِ درویش۔ (فقیر کو جب کسی بات پر غصہ آتا ہے تو اسے اپنی جان پر ہی برداشت کرنا پڑتا ہے) اور کر بھی کیا سکتا تھا؟

یہ فرضی کہانی لالہ تخیلی رام کے دماغ کی اُپج ہے۔ وہ ہر طریقے سے جھجھو کو خوش رکھنا چاہتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ جھجھو کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا ہے۔ اب بغیر اس کے پاس اور کوئی چارہ کار بھی نہ ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ اہلِ غرض دیوانہ ہوتا ہے۔ اب کہانی کا بقیہ حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

دولت رام کے خاندان کا شمار کبھی شہر کے معزز ترین خاندانوں میں ہوتا تھا اور وہ خود بھی بڑے امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتا تھا۔ مگر زمانے کی گردش سے محفوظ نہ رہ سکا: انقلابات میں زمانے کے ساری عزت و خودداری خاک میں مل گئی مگر ایشور جب دیتا ہے تو چھت پھاڑ کر دیتا ہے ایک تسلیم شدہ امر ہے۔ مشہور مقولہ آپ نے بھی ضرور سن رکھا ہوگا:

خدایا کون ہے ثانی تیرا سارے زمانے میں
اشارہ تیرا کافی ہے گھٹانے اور بڑھانے میں

دولت رام کی بیوہ ایک دن کسی پچھلے کمرے میں کھرپے سے مٹی نکال رہی تھی۔ زمین جب تقریباً ایک بالشت بھر کھُد گئی تو اس کا کھرپہ یک لخت کسی سخت ٹھوس چیز سے جا ٹکرایا۔ آواز آئی۔ اب اس نے زیادہ احتیاط سے تھوڑا سا اور کھودا تو زمین میں گڑی ہوئی ایک پیتل کی گاگر نظر پڑی۔ گاگر کے اِرد گرد بوری کے جو ٹکڑے تھے وہ جا بجا پھٹ رہے تھے۔ اپنی عمر کی وجہ سے دریدہ اور بوسیدہ ہو چکے تھے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ دولت رام یا اس کے آبا و اجداد نے یہ گاگر متعدد سال پہلے تہہ زمین دبائی ہوگی۔ دولت رام کی بیوہ نے دروازے اچھی طرح سے بند کیے۔ بوری کاٹی تو اس کی حیرانگی کی حد نہ رہی۔ گاگر میں اشرفیاں بھری پڑی تھیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی پر ماتما کا ہزار بار شکر کیا کہ آخر تو نے بیکسوں کی سُن لی۔ اب پہلا خیال جو اس عورت کے دماغ میں آیا وہ یہ تھا کہ نورِ چشم تو لوگوں کا بھاری بھر کم بوجھ اُٹھاتا ہے اور اس بوجھ کے نیچے پس رہا ہے اُسے فوراً واپس اپنے گھر آنا چاہیے۔ صبح پَو پھٹتے ہی جلدی جلدی زادِ راہ تیار کیا۔ سرجو کے پاس پہنچتے ہی اسے خوش خبری سُنائی اور گھر لے آئی اور اسے کپڑے کی دُکان کھلوا دی۔ لڑکے نے بڑی محنت اور لگن سے کام کیا۔ کام میں پوری دیانت داری دکھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے نام بھی کمایا اور دام بھی کمائے۔ گاہک چھوٹا ہو یا بڑا اس دُکان پر واجب اور مقررہ نرخوں پر ہر قسم کا کپڑا دستیاب ہوتا تھا۔ اس طرح سے آمدن بھی معقول ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ کام بڑھاتا گیا۔ شہر میں وہ سب سے اونچے درجے کی مانی ہوئی دُکان مشہور ہو گئی۔ اب وہ سُرجانہ تھا۔ وہ اب سورج مل بن چکا تھا۔ مایا کی کمی بیشی کے حساب سے انسان کے نام بھی تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ سورج مل شہر کے سبھی سوشل کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ برادری نے اسے اپنا پردھان چن لیا۔ اَندھ وِدیالہ اور سکول کے غریب طلبا کے لیے ہر ماہ چندہ دیتا۔ گویا کہ رفاہِ عام کے سبھی کاموں میں وہ پیش پیش رہنے لگا تو لوگوں نے اسے چودھری سورج مل کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

سورج مل کی ماں نے جب دیکھا کہ لڑکے کے کاروبار میں دن دُگنی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے شہر میں عزت و توقیر بھی ہے۔ لڑکے کا باپ لڑکے کی شادی تو کر گیا مگر بہو ابھی گھر نہیں

آئی تھی کہ وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ کہیں میرا بھی یہی حال نہ ہو، لڑکے کو مجبور کر کے مکلاوہ لانے کی غرض سے سسرال بھیج دیا۔ ایک دن جب وہ گھر کے باہر سیر کو نکلا تو اسے وہی کھڑکی نظر پڑی جس میں کبھی سواری کا سامان پہنچانے کے بعد وہ آکر لیٹا تھا اور جہاں سے ایک لڑکی نے رات کو دس بجے کے قریب اسے بلایا تھا اور لالٹین پکڑا کر کسی دوسرے محلّے جانے کی خدمت سپرد کی تھی حیران رہ گیا۔ دماغ پر زور ڈالا تو اس نے دیکھا کہ سسرال والوں کا مکان تو وہی مکان ہے جس میں وہ ایک بزرگ کا اڈے سے اٹھا کر سامان لایا تھا۔ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اس گھر میں اور کوئی لڑکی بھی نہ تھی۔ اکیلی سروج ہی تھی۔ اسی گھر سے نکلی تھی اور دو گھنٹے باہر بسر کر کے واپس آئی تھی اور بجائے مقررہ مزدوری دینے کے اسی نے سرجو کو چپت لگائی تھی۔ یہ لڑکی اس کی اپنی بیاہتا ہی تو تھی، کوئی اور نہ تھی۔ اس نے اپنے آپ پر بڑا ضبط کیا۔ وہاں کسی فردِ بشر سے مطلق جان بوجھ کر پرانے واقعہ کا ذکر تک نہ کیا۔ البتہ اس فضا میں اب وہ آتش زیرپا ہو رہا تھا۔ پانچ سات دن کا قیام منسوخ کر دیا۔ دوسرے ہی دن واپس اپنے شہر واپسی کا پروگرام بنا لیا۔ اس تبدیلی کا راز کوئی نہ سمجھ سکا۔ سروج بھی نہ سمجھ سکی۔ سورج مل نے راز کو راز ہی رکھا۔ گھر پہنچا۔ ماں نے گھی کے چراغ جلائے۔ بہو کی آمد سے اسے انتہائی خوشی ہو رہی تھی۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتے تھے۔ خوشی سے بھاگی بھاگی سب ہمسایوں کے گھر جا کر بتا آئی۔ ہر طرف سے مبارک مبارک کی صدائیں آ رہی تھیں مگر سورج مل کی کیفیت بالکل دگرگوں تھی۔ وہ تو اپنی بیوی سے بدظن ہو چکا تھا۔ بخیلی رام نے اس اسٹیج پر حجام سے سوال کیا۔ "راجہ! میری بات دھیان سے سن رہا ہے؟" اس نے کہا "جی ہاں"۔ وقت کا تیز رو دریا بہتا گیا۔ شادی کو اب پانچ سال سے بھی زیادہ ہو چکے تھے مگر سورج مل کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ماں کو فکر لگنا قدرتی تھا۔ اولاد کی خواہش روزِ ازل سے رہی ہے اور آج بھی ہے۔ ماں تو ہمیشہ اس بات کی خواہش رکھتی ہے کہ میری اولاد کے گھر آگے اولاد ہو تا کہ خاندان کا کوئی نام لیوا تو ہو۔ علحدگی میں سورج مل کو سمجھانے لگی "میرے سورج! میں اب بوڑھی ہو گئی ہوں۔ کیا پتا اگلا سانس آئے یا نہ آئے۔ یہ دیکھ کر کہ تیرے گھر آج تک اولاد نہیں ہوئی مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ پرماتما کے آگے کسی کا زور

نہیں چل سکتا مگر عقل بھی تو اسی نے دی ہے۔ میری صلاح تو یہ ہے کہ تُو دوسری شادی کر لے قسمت ہر ایک کی جدا جدا ہوتی ہے۔ میں تڑپتی رہتی ہوں کہ تیرے آنگن میں معصوم فرشتے کھیل رہے ہوں، جو مجھے دادی اماں کہہ کر پکاریں۔ سچ مچ زندگی کا مزہ ہی آجائے گا۔ تیرا باپ ایسی چیز کی حسرت لیے اس دُنیا سے چلا گیا۔ کیا میرا بھی وہی حشر ہو گا؟ کیا میرے اُوپر پرماتما اتنا ناخوش ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اوپر والا بڑھیا کی فریاد ضرور سنے گا۔ میرا دل اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ تیرے گھر لڑکا ہی پیدا ہو گا۔ میں سروج کی ہرگز بُرائی نہیں سوچ رہی مگر تیری بھلائی تو مجھے سب سے مقدم ہے۔ تو کسی وقت سروج سے بات چلا۔ اس کے مَن کی بات کا پتا تو لگا۔ تُو خوب جانتا ہے کہ میں سروج سے کتنا پیار رکھتی ہوں۔ ساس اپنی بہو سے خواہ کتنا ہی پیار کرے، بہو کبھی اسے ماں کا درجہ نہیں دے گی ہمیشہ ساس ہی سمجھے گی۔ اس لیے مناسب موقع دیکھ کر تم بات کر لینا مگر میرا ذکر درمیان میں ہرگز نہیں آنا چاہیے۔"

سُورج مل سب پیچ اُونچ سمجھتا تھا۔ اس نے ماں کی بات کو پلے باندھ لیا۔ ایک دن سورج مل نے سُرج سے بات چلائی تو وہ فوراً بولی "میرے پتی دیو! مجھے تو خود بچے کو اس گھر میں کھیلتے دیکھنے کی ازحد خواہش ہے مگر پرماتما کے کاموں میں کس کو دخل ہو سکتا ہے۔ راضی برضا ہی رہنا چاہیے۔ آپ نے آج تازہ پیغام جنت دیا ہے۔ آپ شوق سے شادی کر لو تاکہ خاندان کا نام چلتا رہے۔ میری ہر طرح رضامندی ہے مگر دیکھنا کہیں اپنی سروج کو بھلا نہ دینا۔ آپ کی دونوں بیویاں بہنوں کی طرح ہنسی خوشی اور پریم سے وقت گزاریں گی۔ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیں گی۔ آپ خود دیکھ لینا۔" اس جواب کے ملنے پر سورج مل بہت حیران بھی تھا اور بہت خوش بھی۔ چنانچہ مبارک ساعت دیکھ کر اس نے شہر کے ایک معزز خاندان کی ایک کنیا سے جس کا نام رُکمنی تھا، شادی کر لی۔ سورج مل کی دونوں بیویوں نے واقعی یگانگت کا ثبوت دیا۔ وہ آپس میں سگی بہنوں کی طرح انتہائی پریم سے رہنے لگیں حتیٰ کہ دیوالی کا مبارک تہوار آ گیا۔ ہر طرف چراغ ہی چراغ نظر آ رہے تھے۔ آتش بازی، پٹاخے اور ہوائیاں عجب منظر پیش کر رہی تھیں لکشمی پُوجا کے بعد سروج اور رُکمنی نے جوا کھیلنے کا پروگرام بنایا۔ سروج نے واضح کر دیا کہ سب بھگتان نقد ہی کرنا پڑے گا۔ اب دونوں نے قسمت کے بھروسے پانسہ پھینکنا شروع کیا۔ قسمت کی بات ہے چھوٹی بہو لگاتار ہارتی ہی گئی۔ حتیٰ کہ اسی

کی جیب خالی ہو گئی مگر اس نے منت سماجت کر کے بڑی بہو کو کھیل جاری رکھنے پر رضا مند
کر ہی لیا۔ ہارا ہوا جواری ہمیشہ اسی موہوم خیال میں رہتا ہے کہ اب پانسہ ضرور میرے ہی حق میں
پڑے گا جس سے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ یہی جادو رکمنی پر بھی چل رہا تھا، مگر رکمنی کی بدقسمتی
آڑ میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دنیا امید سے قائم ہے مگر امید عقل کو دھوکہ دے رہی تھی۔ رکمنی قسمت
کے بھروسے کھیلنے میں مگن رہی۔ آخر سرج نے رکمنی سے وہ دو آنے مانگے (اور نقد ادائیگی پر بہت
زور دیا) جو رکمنی کے ذمے رہ گئے تھے۔ جب اس کے پاس تھا ہی کچھ نہیں تو اسے مجبوراً سرج
کے اصرار پر اپنا دوپٹہ گروی کر کے اپنی جان خلاصی کرانی پڑی۔ رکمنی کی بے بسی واقعی قابلِ
رحم تھی۔ بیچاری تڑپ کر رہ گئی۔ پھر سورج مل کے کمرے میں پہنچ کر گڑگڑائی اور دو آنے
مانگے۔ سورج مل سمجھ گیا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ بولا " جانِ من رکمنی! تم نے آج تک
پہلے کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ آج مانگا تو صرف دو آنے۔ میں تو دو چار سو روپے بھی تم پر نچھاور
کر سکتا ہوں۔ مجھے اصل بات تو بتا"! رکمنی نے شرمندگی کو چھپانے کی ناکام کوشش تو کی، مگر
سارا قصہ من و عن کہہ سنایا۔ سورج مل نے منہ میں انگلی دابتے ہوئے جواب دیا۔" رکمنی!
تو اسی وقت سرج کے پاس جا اور اسے کہنا کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے جہاں کسی چیز کی
تقسیم نہیں ہوئی ایک دوسرے کے دوپٹے گروی رکھنا ہرگز زیب نہیں دیتا اور اگر پھر بھی وہ
تیرا دوپٹہ واپس نہ کرے تو اسے برملا کہہ دینا کہ تم نے بھی تو چودھری صاحب کے چار آنے دینے
ہیں۔ محلہ بوگھڑاں سے محلہ راجپوتاں آنے جانے کے ان میں سے تو اپنے دو آنے کاٹ لے ساتھ
ہی یہ بھی اس کے کان میں ڈال دینا کہ چودھری صاحب کہتے ہیں کہ چیپت کا حساب پھر کبھی مناسب
موقع پر کر لیں گے۔" رکمنی نے جا کر پورا پیغام سرج کو پہنچا دیا۔ رنگ فق ہو گیا۔ پاؤں تلے
زمین نکلنے لگی۔ منہ سے ایک لفظ بھی نکلنا مشکل ہو گیا۔ جلدی سے اٹھی اور دوپٹہ لا کر
رکمنی کے ہاتھ میں دے دیا اور لگی ہاتھ پاؤں جوڑنے۔ سرج کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔
میکے کی وہ پرانی ساری پرانی کہانی آنکھوں کے سامنے آ گئی کہ میرے پتی دیو سورج مل

چودھری کون ہیں اور وہ اُس رات کی دو گھنٹے کی غیر حاضری کے بھی چشم دید گواہ ہیں۔ اب وہ بابو جی کی جیتی جاگتی مورت تھی" جھجو پوچھنے لگا۔ "پھر آگے کیا ہوا؟"

بخیلی رام جھجو کو کہنے لگا۔ "سُن پیارے! جو عورت تو نے رات کو جاگتے اور زمین کُریدتے دیکھی وہ بہی سرونج ہی تو تھی۔ راز فاش ہو چکا تھا۔ اس لیے ساس، سوکن اور خاوند کے طعنوں کی کوفت سے بچنے کے لیے وہ زمین میں گڑ جانا چاہتی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اب بول، کارن تیری سمجھ میں آ گیا یا کوئی کسر ہے؟ اٹھا بستر اور چلو اپنے سفر پر۔" جھجو نے ہاتھ جوڑ دیے اور مودبانہ طریقے سے کہنے لگا۔ "سیٹھ جی! آپ کی عقل رسا اور قوت حافظہ کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ بڑے بڑے عقل مند لوگوں سے واسطہ پڑا ہے مگر پرماتما کی قسم تمہارا جواب نہیں۔ گاؤں والوں نے آپ کو مکھیہ چُن کر تمہارے اوپر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ تمہیں تو منصف بننا چاہیے تھا منصف۔ مرحبا! مرحبا! چشم بد دور، میں تو اب آپ کی فہم و ذکا کا قائل اور آپ کی ذات کا بِن داموں غلام بن چکا ہوں۔ آپ کا ہر حکم بندہ کے سر ماتھے پر۔" یہ کہتے کہتے شاہ جی کا بستر سر پر رکھ لیا اور اب یہ یاتری اپنا سفر منزل بہ منزل طے کرتے ہوئے ہردوار جا پہنچے۔ ان کے وہاں پہنچتے ہی پانڈے اور بھکاری لوگ اِرد گرد اس طرح اکٹھے ہو گئے۔ گویا وہ انھی کی مدتوں سے انتظار میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ دونوں کچھ تو سفر کی تھکاوٹ سے چُور چُور ہو رہے تھے۔ کچھ پرماتما نے دل بھی ایسا دیا تھا اُن لوگوں کو گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ ہمارے ہیرو نے تو انھیں ٹکا سا جواب دیا۔ "دیکھو بھائی ہم بڑے پریشان ہو کر کئی دنوں کے پیدل سفر کے بعد یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہمارے پاؤں کے آبلے تو ذرا دیکھیے۔ اگر ہمارے پاس پیسے ہوتے تو گاڑی یا بس میں بیٹھ کر آرام سے نہ آتے۔ آپ ہمیں اور پریشان نہ کیجیے۔ خیر وہ تو چلے گئے یہ دیکھ کر کہ ان تلوں میں تیل نہیں مگر اب ایک اور فقیر نے آ گھیرا۔ بخیلی رام نے اُسے بھی ٹرخا دیا۔ "گر جان طلبی حاضر ست گر زر طلبی مضائقہ در یں ست" یعنی اگر میری جان کی ضرورت ہے تو آپ سے کوئی انکار نہیں البتہ اگر تمہیں روپے پیسے کی ضرورت ہے تو اُس سے میرا انکار ہے۔ بخیلی رام کی یہ سب باتیں جھجو حجام کی آنکھوں میں

کھٹاس رہی نہیں۔ دل ہی دل میں کُڑھتا رہا کہ کس کنجوس کے ساتھ پالا پڑا ہے مگر زیرِ لب مسکرا بھی رہا تھا۔ شاہ جی نے اس کی مسکراہٹ کا جب مشاہدہ کیا تو اسے کہنے لگا "راجہ جھجو! تو اپنے ساتھ کوئی پیسہ ٹکا نہیں لایا؟ میری جان چھڑانے کے لیے کبھی تو تو بھی اپنی جیب ہلکی کر لیا کر۔ تیرتھ یاترا کے کئی فائدے ہیں۔ ثواب مجھے ملتا ہے اور تجھے بھی ملتا ہے۔ ہر کی پوڑی پر اشنان کی اہمیت تو ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ کہتے ہیں کہ برہما جی نے بھی اسی گھاٹ پر یگ کیا تھا۔ خیالات و جذبات میں سدھار ہوتا ہے۔ کنکھل، بھیم گوڈا، سپت دھارا، گوروکل، رشی کل کے دلفریب نظارے تو اپنا جواب نہیں رکھتے۔" دو چار دن وہاں ٹھہرے، ست سنگ میں بھی خوب حصہ لیا، دیرینہ خواہش پوری ہو گئی۔ آتی دفعہ گنگا میں اشنان کی پھر خواہش پیدا ہوئی۔ ایک فقیر نے کنارے پر بُری طرح آ کر گھیرا۔ جان خلاصی کرانے کے لیے بخیلی رام سیٹھ اسے کہنے لگا۔ "جس دن سے اِدھر آئے ہیں آپ لوگوں نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ نہ صبح کو آرام، نہ شام کو آرام۔ اپنا راستہ لو۔ کیوں خواہ مخواہ ہمیں پریشان کر رہے ہو؟" مگر وہ فقیر بھی بڑا ضدی تھا۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔ بخیلی رام نے یہ دیکھ کر اسے پھر کہا۔ "بھائی! ابھی تو میں اشنان کرنے جا رہا ہوں۔ گھنٹہ دو گھنٹے لگ جانے معمولی بات ہے۔ اگر تم ضرور دان لینا ہی چاہتے ہو تو تم انتظار کر سکتے ہو تو کر لو۔" اتنا کہتے ہی دریا میں چھلانگ لگا دی۔ دل کے اندر خیال تو یہ سمایا ہوا تھا کہ اتنا بیوقوف کون ہو گا جو دو گھنٹے انتظار کرتا رہے گا۔ اپنے آپ تنگ ہو کر چلا جائے گا۔ مگر اس فقیر نے اُس جگہ سے ہلنے کا نام نہ لیا، وہیں دھونی جما کر آرام سے بیٹھ گیا۔ یہ فقیر کوئی معمولی فقیر نہ تھا۔ ساکھشات بھگوان تھے جو بخیلی رام کی سب حرکتوں کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے اور اسے راہِ راست پر لانا چاہتے تھے۔ انھیں دیکھ کر بڑی مایوسی ہو رہی تھی کہ نامعلوم یہ لوبھی آدمی کس خمیر کا بنا ہوا ہے جو تیرتھ یاترا پر آنے کے باوجود اپنی ایک بُرائی کو اب تک نہیں چھوڑ سکا۔ اس کا عام لوگوں سے کتنا فرق ہے۔ اس پر سنتوں، مہاتماؤں کے کسی لیکچر کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا۔ ست سنگ کی کتھاؤں سے بھی اس نے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ دان پُن کے متعلق اس کے خیالات میں اب تک تل بھر

بھی فرق نہیں آیا۔ اسے کسی موثر طریقے سے ہی سمجھانا ہوگا۔ آخر بخیلی رام بڑی دیر کے بعد دریا سے باہر نکلا۔ فقیر اپنی جگہ پر ڈٹ کر بیٹھا تھا۔ اس نے بخیلی رام کو جب اس کا وعدہ یاد دلایا تو وہ برجستہ کہنے لگا۔ "بابا! تو تو میرا بھی اُستاد نکلا۔ خواہ مخواہ آپنے دو گھنٹے وقت برباد کیا۔ یہی وقت کہیں اور لگاتے تو کچھ کمائی کر لیتے۔ فقیر بولا۔ "مہاراج! یہاں آپ پن کمانے آئے ہو ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ اگر چاہیں تو تمہیں یہیں بھسم کر دیں"۔ بخیلی رام نے دھمکی آمیز باتیں سنیں تو پارہ تیز ہو گیا۔ غصے کے عالم میں فقیر کو کہنے لگا "جا بابا جا، بھکاری ہو کر اس قسم کی دھمکیاں دیتے ہو۔ .... خلوت دیکھ کر بخیلی رام چھجو کو بڑی خود اعتمادی سے کہنے لگا۔ "دیکھ بھائی! تو نے میری گفتگو جو اس فقیر کے ساتھ ہوئی خوب سُن لی ہوگی۔ ہم کسی سے ڈریں کیوں؟ مگر میں دیکھ کر حیران ہوا کہ تم بالکل میری مدد کو نہیں آئے۔ ایک اور دو گیارہ ہوتے ہیں۔ یہاں تو اکیلا ہی میرا ہمدرد اور غمگسار ہے۔ ہمیں پردیس میں نکل کر تو مکمل یکا نگت اور یک جہتی کا ثبوت دینا ضروری ہے۔ آج میں تمہیں ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں۔ چند دن ادھر آنے سے پہلے میں نے اپنے روپے پیسے کا حساب جو کیا تو وہ پچاس ہزار سے صرف پانچ صد کم نکلے میرے دوست رامو اور شامو جو تیرے پاس گئے تھے عرصہ سے مجھے تیرتھ یاترا کی ترغیب دے رہے تھے۔ میں بھلا کب اُن کے داؤ پیچ میں آنے والا تھا لیکن مجھے تو پچاس ہزار روپے کا مالک بننے کی پرانی خواہش تھی میرے ایک اور دوست نے مجھے بتلایا تھا کہ پیدل تیرتھ یاترا کرنا بڑا لابھدائیک ہوتا ہے اور جو شردھا سے ہردوار جا کر اشنان کرتا ہے گنگا میا اُس کے من کی مرادیں پوری کرتی ہے۔ اب میری عزت گنگا میا کے ہاتھ ہے۔ تو بھی میرے لیے دُعا کرنا۔ اگر کام بن گیا تو تمہیں بھی منہ مانگا انعام دوں گا۔ دوسری تیرتھ یاترا تو مجھے لکھ پتی ہی بنادے گی"۔

اُدھر بھگوان نے اپنی جگہ پر بخیلی رام کو سبق سکھانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس لیے انھوں نے ہو بہو بخیلی رام کا روپ اختیار کر لیا۔ وہی وضع قطع، وہی شکل و شباہت، رنگ روپ اور بول چال غرضیکہ پوری پوری نقل اُتار لی اور پانی پت بخیلی رام کے گھر جا پہنچے۔ ہردوار کا پرشاد

اور کپڑے و کھلونے، جو ساتھ تھے گھر کے سارے افراد چھوٹے بڑے اکٹھے ہو گئے تو انھیں بانٹ دیے۔ ہر ایک کے چہرے پر خوشی برس رہی تھی کہ سیٹھ جی تیرتھ یاترا کر کے آخر کار راضی خوشی واپس تشریف لے آئے ہیں۔ بھگوان جی جنھوں نے بخیلی رام کا بھیس بنا رکھا تھا۔ اپنے سب گھر والوں کو اب سمجھانے لگے "دیکھیے! ہردوار میں مجھے ایک بہروپیا ملا تھا۔ وہ ہر انسان کی پوری پوری نقل اتارنے کے فن میں اتنی مہارت رکھتا ہے کہ اصل اور نقل کی تمیز بمشکل ہو جاتی ہے۔ اس نے وہاں جو پریکٹیکل ثبوت دیا وہ دیکھ کر میری عقل تو واقعی دنگ رہ گئی۔ وہ مختلف شہروں میں گھومتا رہتا ہے۔ دیکھنا کہیں اس کے چکمے میں نہ آ جانا۔ بڑا چالاک ہے وہ۔ اس نے مجھ سے میرے گھر کا پتہ بھی لے لیا تھا۔ اس لیے خبردار رہنے کی اشد ضرورت ہے۔ کہیں وہ میری غیر حاضری میں اِدھر آ نکلے تو اسے تجوری کی چابیاں نہ دے دینا۔ نہیں تو وہ سب کچھ لُوٹ کر لے جائے گا۔ اور ہم کنگال ہو جائیں گے بلکہ میری تجویز تو یہ ہے کہ اگر وہ آ نکلے تو اسے دروازے کے اندر گھسنے ہی نہ دینا۔ اس کی مرمت پتھر اور اینٹوں اور جوتے پیزار سے کرنا تاکہ اسے پھر کسی کے گھر جانے کا حوصلہ ہی نہ پڑے" یہ سبق گھر والوں کو پڑھا کر اور اچھی طرح ذہن نشین کرا کر بھگوان جی پوری طرح مطمئن ہو گئے۔ ہفتہ عشرہ ہی گذرا ہو گا کہ گھر کا اصلی مالک یعنی سیٹھ بخیلی رام بھی اپنے گھر واپس آ پہنچا۔ دروازہ اتفاق سے اندر سے بند تھا۔ جونہی اس نے اپنے لختِ جگر کا نام لے کر پکارا تو گھر والے سارے اچھی طرح چوکنے ہو گئے۔ برخوردار نے دروازہ نہ کھولا۔ بخیلی رام نے اب اپنی بیوی کو نام سے پکارا۔ وہ اور دوسرے گھر کے افراد دروازے کے اندر سے اس طرح اسے دیکھتے رہے گویا وہ کوئی چور یا ڈاکو ہو۔ دروازہ کھولنا تو در کنار۔ انھوں نے اندر سے پتھر مارنے شروع کر دیے۔ بہتیرا چیخا چلایا کہ تم مجھے دروازہ کیوں نہیں کھولتے۔ کیا میں اب بدل گیا ہوں؟ میں وہی گھر کا مالک ہوں جو کبھی چھجو کے ساتھ ہردوار گیا تھا۔ آپ لوگوں کی عقل معلوم ہوتی ہے گھاس چرنے گئی ہے۔ ایسا حال تو میں نے ساری عمر میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تیرتھ یاترا سے تو انسان کی حالت سدھرتی ہے یہاں حالت اس کے برعکس نظر آ رہی ہے میری

قسمت میں ہی کچھ دوش معلوم ہوتا ہے"۔ اندر سے آوازیں آئیں "چلے جاؤ یہاں سے۔ بہروپیا بن کر ہمیں ٹھگنے آئے ہو۔ یہاں تمھاری دال نہیں گلے گی۔ ہمیں ہمارے پتا جی نے تمھارے متعلق پہلے ہی اچھی طرح خبردار کر رکھا ہے۔ ہم تمھاری باتوں میں آنے کے نہیں۔ جان کی سلامتی چاہتے ہو تو جلدی جلدی بھاگ جاؤ یہاں سے۔ ورنہ پتھر اینٹ سے تمھارا ہم وہ حال کریں گے کہ ساری عمر یاد رکھو گے"۔ بجلی رام باہر کھڑا ہی رہا۔ حیران پریشان کہ اب کیا کروں۔ دروازہ چھوڑ کر کدھر کو منہ کروں۔ شاید گھر والوں کی عقل ٹھکانے آ جائے۔ اسی موہوم خیال سے دروازے کے پاس کھڑا تھا کہ گھر والوں نے اینٹوں کی بارش شروع کر دی۔ بیچارہ لہو لہان ہو گیا۔ تب جان بچانے کے لیے وہاں سے بھاگا۔ سیدھا شمشان گھاٹ جا پہنچا کہ اب یہاں سے تو کوئی نہیں اٹھائے گا۔ بدقسمتی نے تو ابھی پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس بیچارے کے زخموں سے اتنا خون بہہ رہا تھا کہ تمام کپڑے خون سے لت پت ہو رہے تھے۔ جسم برسوں کے بیمار کی طرح نڈھال ہو رہا تھا۔ اُدھر بھوک پیاس نے ستا رکھا تھا۔ رات بھر تفکرات میں کروٹیں بدلتا رہا۔ خیالات کے سمندر میں دیر تک غوطے لگانے کے باوجود کوئی کنارہ نہ مل سکا۔ کوئی راہِ فرار نظر آ رہی تھی۔ مصیبتیں جب بھی آتی ہیں، اکٹھی ہی آتی ہیں۔ ہر طرف سے مایوسی ہی مایوسی نظر آ رہی تھی۔ اس لیے اپنے پروردگار کی شرن میں گر پڑا۔ رو دھو کر رات کاٹی۔ نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ بھگوان کسی کو بھی اس کے گناہ سے زیادہ سزا نہیں دینا چاہتے اس لیے اگلی صبح ایک درویش کے بھیس میں بجلی رام کے پاس شمشان گھاٹ ہی پہنچ کر اسے کہنے لگے۔ "اے بھائی! مجھے اب تو کچھ کھانے کو دے دو۔ اشنان ہو چکا؟ تیرے کہنے کے مطابق میں نے گھنٹہ دو گھنٹہ خوب انتظار کی۔ مگر تم نے تو کہہ دیا کہ جا بابا جو کچھ کرنا ہو کر لو۔ اس لیے میں وہاں سے چلا آیا۔ اب دیکھ لیا نتیجہ"۔ بجلی رام یہ سن کر دنگ رہ گیا۔ اس نے بعینہٖ یہی الفاظ فقیر کو ہردوار میں کہے تھے۔ سوچ کر کہ ایسا معجزہ تو بھگوان ہی کر سکتے ہیں۔ انسان تو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں کر سکتا۔ اٹھا اور اٹھ کر فقیر کے پاؤں پکڑ لیے۔ اور گڑگڑانے لگا۔ "میرے سوامی! آپ بڑے دیالو ہیں۔ میں گنہگار ہوں۔ کرپا کر کے میرے

گناہ بخش دیجیے۔ مجھے صحیح راستہ بتائیے کہ میں اس پر چل کر اپنی بقیہ زندگی بامقصد طریقے سے گزاروں۔ میں آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کا یقین دلاتا ہوں۔ مجھے صحیح حالت میں گھر صرف آپ ہی پہنچا سکتے ہیں۔" بھگوان جنھوں نے فقیر کا بھیس بدلا ہوا تھا، کہنے لگے: "بھگت! اُن کسی سے بھی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہرگز سخت کلامی مت کیا کر۔ تم دولت کے سُندر رُوپ میں بُری طرح پھنسے ہوئے ہو۔ مایا پر سانپ بن کر پہلبانی کرتے رہتے ہو۔ تمھیں ہر وقت لکھ پتی بننے کی خواہش لگی رہتی ہے۔ تیرے پاس پرماتما کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔ تیرے ہمسایہ غریب لوگ بستے ہیں۔ کبھی تُونے کسی ایک حاجت مند کی بھی حاجت روائی نہیں کی۔ کبھی کسی بیوہ، یتیم اور بے کس کے تو کام نہیں آیا۔ کسی نادار کو پرماتما کے نام پر کبھی کچھ دیا ہے؟ گویا خیرات نہ دینے کی تو تم نے قسم کھا رکھی ہے۔ یہ مایا آنی جانی چیز ہے۔ ہمیشہ ایک جگہ پر قائم نہیں رہتی۔ تو اس دولت کے سُندر رُوپ میں پھنس کر اپنی ہر قسم کی ذمہ داریوں کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ اسے بانٹ کر کھانا چاہیے۔ دولت کی اچھائی یا بُرائی کا فیصلہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ کس مصرف میں لائی جائے گی۔ زکوٰۃ دو۔ دسوندھ دو یا اس کا کچھ اور نام رکھ لو مگر یہ ایک اصول اپنا لو کہ آمدنی کا کچھ مقررہ حصہ باقاعدگی سے اچھے کاموں پر صرف کرنا ہے۔ مستحق اشخاص کو دو اور دو بھی اس طرح کہ ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے ہاتھ کو پتہ نہ لگے۔ نمود و نمائش کے لیے دینا غلط ہے۔ تمھیں پتہ ہوگا کہ قارون جیسا امیر بادشاہ مر گیا تو آج اس کا کوئی نام بھی نہیں لیتا مگر حاتم طائی کا نام سخاوت کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے۔ زندگی ناپائیدار ہے۔ وقت اور دولت کا فائدہ اُٹھاؤ۔ آج جو کچھ اپنے ہاتھوں سے دوگے اس کا دوچند بلکہ دہ چند موت کے بعد ملے گا۔ آج تمھیں زندگی کا معرکہ کا راز بتلا دیا ہے۔ اس پر عمل کروگے تو دُنیا میں بھی نیک نام کماؤگے اور اپنی آخرت بھی سنوار لوگے۔ بےشک عمر کا زیادہ حصہ تم گزار چکے ہو، مگر انسان اپنی تصحیح ہر سٹیج پر کر سکتا ہے۔" اتنا کہتے کہتے بھگوان نے بخیلی رام کے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ وہ آناً فاناً بھلا چنگا ہو گیا۔ انتہائی ممتا سے سادھو کو پرنام کر دوڑا دوڑا اپنے گھر جا پہنچا۔ گھر والوں نے اس کے صدقے لیے۔ بھگوان کا کرشمہ اپنا کام کر چکا تھا۔ اس لیے بھگوان کا پڑھایا ہوا سبق سب کی یاد سے اُتر چکا تھا۔ سب گھر میں

خوشی ناچ رہی تھی۔

ابھی بھگوان نے بخیلی رام کا امتحان لینا تھا اس لیے دو دنوں کے بعد اس کے گھر جا پہنچے اور اس سے دان مانگا۔ بخیلی رام فوراً ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "مہاراج! پھر بار یہ ال ودولت سب کچھ آپ کا ہی دیا ہوا ہے۔ مَیں سب کچھ آپ کے ارپن کرتا ہُوں تاکہ مَیں آزادی سے کسی الگ جگہ بیٹھ کر پرماتما کا نام لے سکوں۔ مَیں نے زندگی میں ایک بڑا سبق سیکھ لیا ہے۔ یہ دولت جسے مَیں دُنیاوی خدا کا درجہ دیتا تھا میرے کسی طرح کام نہ آئی۔ لوگوں میں مجھے بُرے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مجھے بدقدم کا لقب مِلا ہوا ہے۔" بھگوان کہنے لگے "مایوس مت ہو۔ تو میری بات پلّے باندھ لے تیرا کھویا ہوا وقار بحال ہو جائے گا۔ نصف دولت تو اپنے ہی پاس رکھ۔ اپنا کاروبار چلا اپنے عیال و اطفال پر صرف کر۔ کیوں کہ یہ تیرا فرض ہے۔ باقی نصف رفاہِ عامہ کے کاموں میں لگا دے، مگر دیانت داری سے" بخیلی رام اب پُرانا بخیلی رام نہیں رہا تھا۔ اس نے گاؤں میں شفاخانہ، بارات گھر، سکول بنوا دیے۔ یتیموں اور بیواؤں کے وظیفے باندھ دیے۔ اناتھ آشرم میں خود جا کر لنگر بانٹتا، اور سب سوشل کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگا اور پہلے کی نسبت زیادہ خوش و خرم رہنے لگا۔ اپنے دوستوں کو برملا کہتا کہ ان سب کاموں میں رقم لگانے کے بعد بھی میری دَولت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جس طرح ہَوا کا رُخ بدلنے سے پتنگ کا رُخ بدل جاتا ہے۔ اُسی طرح بخیلی رام کے خیالات میں ایسا زبردست انقلاب آیا کہ سب دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ اُس مہاتما نے اپنی نیک رہنمائی سے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ انسان کے خیالات ہی سب کچھ ہیں۔ انھی کی بدولت انسان دیوتا بن جاتا ہے۔ یا راکشس بن جاتا ہے۔ وقت کے چند لمحات پُوری زندگی کا عنوان بدل دیتے ہیں۔ اس کایا پلٹ کو دیکھ کر جھجّو سب سے زیادہ حیران تھا کہ ساتھی کو واقعی گنگا اشنان کا ثواب مِل گیا ہے۔ زندگی میں تو سیٹھ جی کو انجانی خوشی کا احساس رہنے لگا اور مرنے کے بعد بھی وہ مستقل یادگاریں چھوڑ گیا۔ کسی نے درست کہا ہے۔ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

(ختم شد)
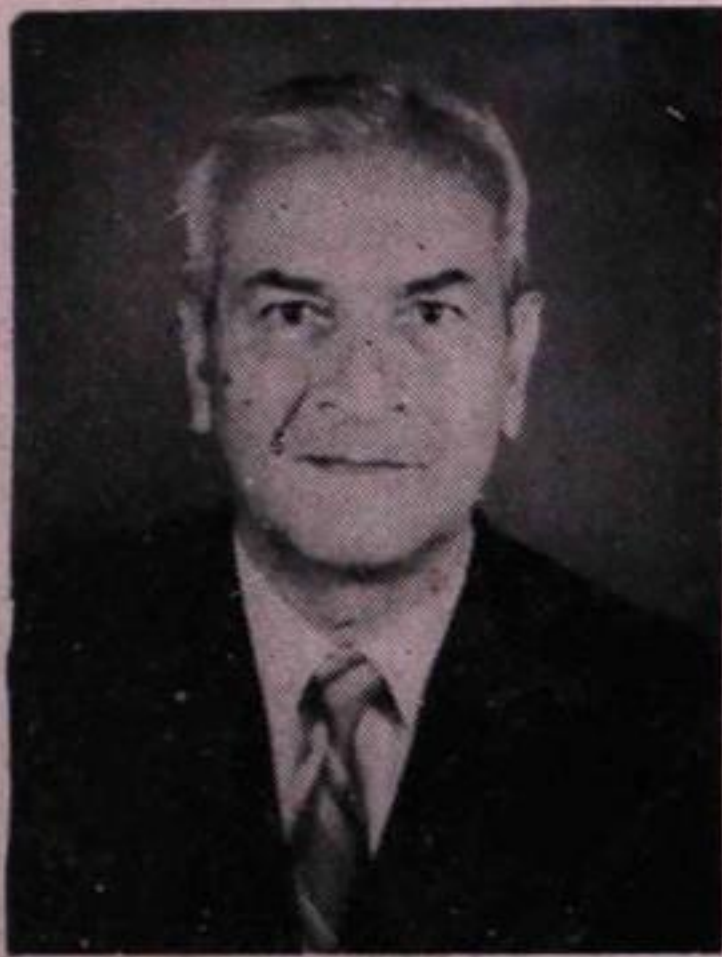
تعارف

مصنف کا نام : ویدراج ٹوٹیجہ

پتہ : کوٹھی ۲۸۴ سیکٹر ۷ بی، فرید آباد (ہریانہ) ۱۲۱۰۰۶

تاریخ پیدائش : ۵ ستمبر ۱۹۱۷ء

جائے پیدائش : حویلی لکھا، ضلع منٹگمری (حال پاکستان)

تعلیمی قابلیت : ایم اے۔ ادیب عالم۔ ادیب فاضل (پنجاب یونیورسٹی)

مادری زبان : پنجابی

پیشہ : ریٹائرڈ تحصیل دار، ہریانہ اسٹیٹ

نام کتاب : انمول رتن

موضوع کی اہمیت : پند و نصائح، تفریح طبع اور پرانے تذکرے